بھوت محل
اشتیاق احمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمود، فاروق، فرزانہ

اور — انسپکٹر جمشید سیریز

ناول نمبر ۵۵۹

بھوت محل

اشتیاق احمد

نام ناول ــــ بھوت محل

طبع اوّل ــــ یکم فروری ۱۹۹۴ء

طابع ــــ اشتیاق احمد

کتابت ــــ سعید نامدار

سرورق ــــ طاہر ایس ملک

قانونی مشیر ــــ اعجاز احمد ایڈووکیٹ

مطبع ــــ علیم علیم پرنٹرز

قیمت ــــ دس روپے

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ آقائے نامدار حضور نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جب کھانا رکھا جائے تو اس کے کنارے میں سے لو اور اس کا بیچ چھوڑ دو، اس لیے کہ برکت بیچ میں سے اُترتی ہے۔

سُنن ابنِ ماجہ شریف، جلد سوم
صفحہ نمبر ۵۴، حدیث نمبر ۱۶۲

دو باتیں

السلام علیکم!

یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسپکٹر جمشید کے اندازے عام طور غلط ثابت نہیں ہوتے، لیکن میرے اندازے خاص طور پر غلط ثابت ہوتے ہیں اور اس کا ثبوت ہے قارئین کے کچھ خطوط — ان قارئین کے اندازے میرے بارے میں دراصل بالکل غلط ثابت ہو گئے — اگر میرے اندازے ان کے بارے میں غلط ہو گئے تو یہ کوئی عجیب بات بھی نہیں —

بات شاید آپ کی سمجھ میں نہیں آئی ہو گی — مثال دے کر سمجھانا ہو گی — لیکن ہو سکتا ہے — مثال دے کر سمجھانے پر بھی آپ کی سمجھ میں نہ آئے — اس لیے کہ یہ معاملہ ہے، اندازوں کے غلط ہونے نہ ہونے کا — تو میرا یہ اندازہ بھی تو غلط ثابت ہو

سکتا ہے کہ مثال دے کر آپ کو سمجھا سکتا ہوں، لیکن میرا یہ اندازہ غلط ثابت نہیں ہو سکتا کہ میں مثال دے کر سمجھانے کی کوشش تو کر سکتا ہوں —

لیجیے — کوشش ملاحظہ فرمائیں:

یار لوگ مجھ سے بہت بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں — مثلاً یہ کہ ملک میں کوئی مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے تو مجھے خطوط لکھتے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ میں اس سلسلے میں نہ جانے کیا کر گزروں گا — حالانکہ زیادہ سے زیادہ ہو یہ سکتا ہے کہ میں ناولوں کی دو باتیں میں اس مسئلے کا ذکر کر دوں، تاکہ بات آپ تک بھی پہنچ جائے — لیکن اس سے زیادہ میں بھلا کیا کر سکتا ہوں — میں نہ تو کوئی ایم این اے ہوں — نہ ایم پی اے — نہ میری کوئی سرکاری حیثیت ہے — پھر بھلا میں کیا کر سکتا ہوں — خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ کوئی معاملہ عدالت میں بھی چل رہا ہو — عدالتوں میں جو معاملات چل رہے ہوتے ہیں — ان پر تو ویسے بھی ہم بات نہیں کر سکتے — توہین عدالت کا پہلو بھی نکل سکتا ہے — اس طرح وہ یار لوگ جو میری توجہ ان مسائل کی طرف دلاتے ہیں،

دفتر کا نیا فون نمبر

اشتیاق پبلی کیشنز کے دفتر واقع "سانده کلاں لاہور" کا فون نمبر تبدیل ہوگیا ہے۔ نیا فون نمبر

7246356

ہے۔ قارئین کرام، ایجنسی ہولڈرز، بک سٹال مالکان اور لائبریری مالکان نوٹ فرمالیں۔ شکریہ!

★

اشتیاق پبلی کیشنز

۹/۱۲ نصیر آباد۔ سانده کلاں۔ لاہور

پھر دیکھا ہے

بارش موسلا دھار شروع ہو گئی تھی۔ انسپکٹر جمشید کی کار کے وائپر تیزی سے چل رہے تھے، لیکن اس کے باوجود انھیں آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا:

"اب آئے گا ایڈونچر کا صحیح مزا۔" کار میں فارُوق کی آواز گونجی۔

وُہ گھر سے تفریح کے لیے نکلے تھے۔ لیکن انسپکٹر جمشید کا کہنا تھا، تفریح صرف تفریح نہ ہو، اس میں کچھ ایڈونچر بھی ہو۔ مثلاً یہ کہ گھر سے کھانے پینے کا کوئی سامان ساتھ نہ لیا جائے۔ صرف ایک کار اور جسموں پر جو لباس ہیں، بس وہی ہوں۔ اور آخری بات یہ کہ جیبوں میں پیسے بھی بہت تھوڑے سے ہوں۔ صرف اتنے کہ گاڑی میں پٹرول ختم ہو جائے تو ڈلوا لیا جائے اور بس۔ ان حالات میں انھیں موسلا دھار بارش نے آ

گھِرا تھا، جب کہ وہ شہر سے دو سَو کلو میٹر دُور تو
نکل ہی آئے ہوں گے:

"ہاں فارُوق! تم نے بالکل ٹھیک کہا — اصل ایڈونچر یہ
ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کاش! انکل خان رحمان بھی ہمارے ساتھ آئے
ہوتے۔" فرزانہ بولی۔

"کیا کہ رہی ہو — میں ساتھ بیٹھا تو ہوں — اور یہ تو
کار بھی میری ہے۔" خان رحمان نے حیران ہو کر کہا۔

"اگر یہ بات ہوتی انکل — تو..." فرزانہ نے کہنا چاہا،
لیکن اُسی وقت فارُوق بول اُٹھا:

"پہلے یہ بتا دو کہ کون سی بات اگر ہوتی؟"

"تم احمق ہو ایک دم۔" فرزانہ جھلّا کر اس کی طرف مڑی۔

"تو پھر جملہ اس طرح بولو — تم احمق ہو ایک دم
انکل تو..." فارُوق مسکرایا۔

"دیکھا انکل — اب یہ آپ کو غصّہ دلانے کے لیے
پَر تول رہا ہے۔"

"ایسے میں دیکھ کیسے سکتا ہوں۔" خان رحمان گھبرا گئے۔

"بالکل فضول بات کہی فرزانہ نے۔" اب محمود سے بھی
رہا نہ گیا۔

"کیوں — ایسا کیا کہ دیا میں نے۔" فرزانہ نے آنکھیں
نکالتے ہوئے کہا۔

"اس قدر شدید بارش میں کوئی پَر تول سکتا ہے بھلا۔"
محمود نے کہا۔

"ہم — میرے خیال میں تو نہیں تول سکتا۔" پروفیسر داؤد
کی آواز اُبھری۔

"اوہ! یہاں تو پروفیسر انکل بھی موجود ہیں۔"

"میں دراصل بہت گہری سوچ میں گم تھا۔" پروفیسر داؤد نے
اب بھی گہری سوچ میں گم انداز میں کہا۔

"تو بتا دیجیے نا — آپ کس گہری سوچ میں گم تھے؟"

"پہلے تو مجھے یہ سوچنا ہو گا — بہت گہرے انداز میں کہ
وہ کیا گہری سوچ — ارے ہاں! یاد آگیا۔"

"چلیے صبح کا بھولا شام کو گھر آگیا — جلدی بتائیے۔"
فارُوق چہکا۔

"بالکل غلط وقت پر ضرب المثل کہی — یہ موقع اس کا
تو ہرگز نہیں تھا۔" محمود نے اسے گھورا۔

"یہ سوچنے میں وقت لگ جاتا — کہ اس موقعے پر کون
سی ضرب المثل کا موقع ہے۔" فارُوق ہنسا۔

"کم از کم ان حالات میں ہنسو تو نہ — کہیں بارش

بُرا نہ مان جائے۔"

" اور بُرے سے تمہاری کیا مُراد ہے — کیا یہ پہلے ہی بُرا مان کر برس رہی ہے۔" پروفیسر داؤد نے گھبرا کر کہا۔

" جی ہاں بالکل! آپ دیکھ نہیں رہے — کس بُری طرح برس رہی ہے — ورنہ کچھ تو اچھی طرح برستی۔" فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

" اگر تم نے پروفیسر صاحب کو بات نہ پوری کرنے دی — تو میں بھی بہت بُری طرح پیش آؤں گا۔" انسپکٹر جمشید کی سرد آواز گونجی — وہ گاڑی چلا رہے تھے اور سڑک کو دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے، لیکن سڑک کا تو اب دُور دُور تک پتا نہیں تھا — وہ تو اس طرح غائب تھی جیسے گدھے کے سر سے سینگ — پھر بھی وہ اگر گاڑی چلا رہے تھے تو یہ ان ہی کی ہمت تھی۔

" چلیے انکل — پہلے آپ بات پوری کر لیں۔"

" ل — لیکن — کون سی بات"؟ وہ گھبرا گئے۔

" لیجیے ابّا جان! اب یہ انھیں آپ بتائیں کہ یہ کون سی بات بتائیں۔" فاروق نے فوراً کہا۔

" تم لوگوں کی باتوں میں الجھ کر تو اچھے اچھے بھول جاتے ہیں — یہ تو بے چارے پروفیسر ہیں۔" خان رحمان نے ہنس

کر کہا۔

" ہائیں ہائیں انکل — آپ نے یہ کیا کہہ دیا۔" محمود نے بوکھلا کر کہا۔

" گ — کیا کہہ دیا — کیا کوئی غلط بات کہہ گیا؟"

" تو اور کیا — آپ نے کہا ہے — کہ ہماری باتیں سن کر تو اچھے اچھے بھول جاتے ہیں، تو کیا پروفیسر انکل اچھے اچھوں سے کم ہیں؟"

" اوہ ہاں واقعی — یار جمشید — یہ تو میں بالکل غلط بول گیا — پروفیسر صاحب تو مان گئے ہوں گے۔ بہت سے بھی کہیں زیادہ بُرا — اب میں کیا کروں؟"

" معافی مانگ لو فوراً — نیک مشورہ ہے — یُوں بھی بارش اور تیز ہوتی جا رہی ہے — زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔"

" ارے باپ رے — تب تو پروفیسر صاحب — آپ مجھے فوراً سے پہلے معاف کر دیں۔"

" فف — فوراً سے پہلے — لل — لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں معافی کس بات کی دوں — میں تو سُن ہی نہیں سکا کہ تم نے میری شان میں کیا بات کہی ہے — اس لیے کہ میں پھر اسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔"

"چلیے پھر تو ٹھیک ہے — اگر آپ میرے الفاظ سُن ہی نہیں سکے تو پھر معافی مانگ کر کیا کروں گا — کیوں جمشید — اس صورت میں تو ضرورت نہیں رہی؟"

"نن — نہیں۔" وہ بولے۔

"تو آپ نے نہیں بے چارے کے دو ٹکڑے کیوں کر دیے؟"

"لیجیے — اب نہیں بھی بے چارہ ہو گیا۔"

"اس قدر تیز بارش میں کوئی چیز ہے — جو باچارہ رہ گئی ہو۔" فاروق بولا۔

"اب تم سے کون مغز مارے۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"اس گاڑی میں ہیں ہی کتنے افراد — ظاہر ہے — یہی ماریں گے۔"

"میں تمھیں واقعی مار بیٹھوں گا۔" انسپکٹر جمشید نے جھلا کر کہا۔

"گگ — کیوں ابا جان — میں نے ایسا کیا کر دیا ہے؟"

"ابھی تک پروفیسر صاحب کو موقع نہیں دیا تم نے۔"

"اوہ اچھا — لے لیجیے انکل۔" فاروق نے گویا حاتم طائی کی قبر پر لات ماری۔

"گگ — کیا لے لوں — یہ بھی تو بتاؤ۔" پروفیسر بے خیالی کے عالم میں بولے۔

"جی — موقع — بات کرنے کا — اور کیا — ابا جان جاننا چاہتے ہیں کہ آپ کس گہری سوچ میں گم تھے۔"

"میں سوچ رہا تھا۔"

"ضرور آپ اپنی کسی ایجاد کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے۔" ایسے میں فرزانہ بول اٹھی۔

"اب درمیان میں دخل میں نے نہیں دیا ابا جان۔" فاروق نے اعلان کیا۔

"یہ جملہ بول کر تو دیا ہے دخل۔" انھوں نے تلملا کر کہا اور پھر فرزانہ کی طرف پلٹ پڑے:

"تم سے بھی رہا نہیں گیا۔"

"مم — معافی چاہتی ہوں ابا جان۔" فرزانہ نے گھبرا کر کہا۔

"یار جمشید — ان پر بگڑو نہیں — تمھارا ان پر بگڑنا — برسنا، جھلانا، تلملانا اور غرّانا مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔" خان رحمان نے بھی گھبرا کر کہا۔

"ہائیں انکل — آپ ان سب چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں۔" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"یہ تم سے کس نے کہ دیا؟"

"آپ نے — ابھی کہا نہیں — ایک آنکھ نہیں بھاتا۔"

"یار چُپ رہو — میں محاورے کی زبان میں بات کر رہا

تھا — سمجھا کرو۔" خان رحمان بولے۔

"ج — جی — سمجھ گیا — چلیے انکل — اب آپ سمجھا دیں
ذرا۔" فاروق نے پروفیسر داؤد سے کہا۔

"یار کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی — بس رہنے دو"
پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"جی — یہ کیا بات ہوئی — اب یہ خاموش ہوئے ہیں
تو آپ بتانے سے بھاگ رہے ہیں۔"

"مم — میں — بھاگ تو نہیں رہا — اور اس کار میں
بھاگ بھی کس طرح سکتا ہوں — جب کہ باہر طوفانی بارش
رہی ہے۔"

"اب یہ طوفانی سے بھی کہیں آگے بڑھ گئی ہے۔
بلاخیز کہا جا سکتا ہے۔" انسپکٹر جمشید فکرمندانہ انداز میں بڑبڑائے
ان میں فکرمندی کے آثار محمود نے فوراً بھانپ لیے۔
وہ بھی فکر مند ہو کر بولا:

"آپ کچھ فکرمند سے لگ رہے ہیں ابا جان — اگر آپ فکرمند
ہو گئے تو ہمارا کیا بنے گا — ہم تو مارے فکر کے ہو جائیں
گے بہت دُبلے۔"

"یار ہم قاضی نہیں ہیں — اور نہ اس وقت شہر کا اندیشہ
ہے۔" فاروق بولا۔

"میں فکر مند ہوں، لیکن پریشان نہیں ہوں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"یہ کیا بات ہوئی — کیا اس میں کوئی فرق ہے؟"

"ہاں شاید — فکر صرف یہ ہے کہ بارش کم ہونے کے
کوئی آثار نظر نہیں آ رہے — اور پریشان اس لیے نہیں ہوں
کہ ہوتا تو وہی ہے — جو اللہ کو منظور ہوتا ہے۔"

"تب پھر آپ فکر مند بھی نہ ہوں۔" فرزانہ نے گھبرا
کر کہا۔

"اچھی بات ہے، نہیں ہوتا — ہاں تو پروفیسر صاحب —
آپ کیا سوچ رہے تھے؟"

"میرا خیال ہے — مجھے اپنی سوچ اپنے تک ہی رکھنی چاہیے۔"
انھوں نے گھبرا کر کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی — لیکن اس طرح ہم اُلجھن محسوس
کریں گے۔"

"ہاں انکل — واقعی — لہٰذا آپ بتا ہی دیں۔"

"اچھی بات ہے — بات یہ ہے کہ میں سوچ رہا تھا،
اب کھانے والے کا کیا ہو گا؟"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا — سب کے چہروں
پر مسکراہٹ کی کرنیں بکھر گئیں، لیکن فوراً یہ کرنیں بجھ گئیں
اور گاڑی میں گہری خاموشی ہو گئی — کیونکہ بھوک تو انھیں

بھی محسوس ہو رہی تھی ۔۔ وہ تو گھر سے بھی کچھ کھا کر نہیں
چلے تھے ۔۔ انسپکٹر جمشید نے انھیں اتنی مہلت بھی تو
نہیں دی تھی ۔ بس کہتے رہے ۔ اصل ایڈونچر یہی ہے ۔

"اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھیں ۔ کھانے کا بندوبست بھی
ہو جائے گا ۔ پہلے تو کوئی پناہ گاہ تلاش کرنی چاہیے۔"

اور پھر اچانک ان کی کار رک گئی ۔

"شاید سائیلنسر میں پانی چلا گیا۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے ۔

"مطلب یہ کہ اب گاڑی نہیں چلے گی۔"

"نہیں ۔۔ ہمیں یہیں اترنا ہو گا۔"

"اس برستی بارش میں ۔۔ اور ہمارے کپڑے ۔"

"زیادہ سے زیادہ یہی نا کہ بھیگ جائیں گے۔" وہ مسکرائے

"وہ بھی بُری طرح ۔" فاروق نے کہا ۔

"اب اچھی طرح تو بھیگنے سے رہے ۔ آئیے ۔ بسم اللہ
کرتے ہیں ۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید گاڑی سے نیچے اُتر گئے تو پانی ان
کے گھٹنوں تک آ گیا :

"اس جگہ پانی میرے گھٹنوں تک ہے ۔ آگے چل کر نہ جانے
پانی کتنا ہو جائے ۔۔ خیر ۔ اللہ کا شکر ہے ، ہمیں تیرنا آتا ہے"

اب باقی لوگ بھی اُترے :

"م ۔ میری ۔ تو رانوں تک پانی آ رہا ہے۔" محمود نے
گھبرا کر کہا ۔

"اب بھول میں دھت تیرے کی نہ کہہ بیٹھنا۔" فاروق بولا ۔

"ہاں واقعی ۔ ران پر ہاتھ کس طرح مارو گے ۔ وہ تو
پڑے گا پانی پر ۔ اور پانی کہیں بُرا نہ مان جائے۔"

"آج اگر جلد ہمیں کوئی پناہ مل گئی تو میں سو نفل پڑھوں
گا۔" انسپکٹر جمشید بولے ۔

"تب پھر ہم بھی آپ کا ساتھ دیں گے۔" محمود نے کہا ۔

عین اس وقت بجلی بہت زور سے کڑکی ۔ پوری فضا چکاچوند
ہو گئی :

"م ۔ میں نے ۔ میں نے ۔" فرزانہ نے کہنا چاہا ، لیکن اسی
وقت اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ لگی گرنے ۔ لیکن انسپکٹر جمشید
نے فوراً اسے تھام لیا ۔

"ذرا سنبھل کر بھئی ۔ یہاں چلنا بھی تو آسان کام نہیں ہو گا۔"

"اور ہماری گاڑی کا کیا بنے گا جمشید ؟" پروفیسر داؤد بولے ۔

"پروا نہ کریں ۔ میں اتنا غریب آدمی نہیں ہوں کہ ایک
گاڑی کا نقصان برداشت نہ کر سکوں۔" خان رحمان نے
فوراً کہا ۔

"میں نے یہ بات اس لیے نہیں کہی تھی خان رحمان۔"

پروفیسر داؤد ان کی طرف مڑے۔

"تو پھر؟"

"گاڑی اگر پانی میں بہ کر کہیں دُور نکل گئی تو ہمار
واپسی کا کیا ہو گا؟"

"آپ تو ابھی سے واپسی کی سوچنے لگے انکل ۔ ابھی
ایڈونچر شروع ہوا ہے۔"

"بھئی میری تو توبہ ۔ آیندہ کم از کم اتنے سخت ایڈو
کی تائید نہیں کروں گا ۔ یہ شرط رکھوں گا کہ گاڑی
ڈکی کم از کم کھانے پینے کی چیزوں سے بھری ہوئی چا
پروفیسر داؤد نے کہا۔

"چلیے خیر ۔ ہم آیندہ آپ کے لیے کھانے کی چیزیں سا
لے آیا کریں گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا کہا ۔ صرف میرے لیے ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"لیکن انکل ۔ یہ تو بعد کی باتیں ہیں ۔ اس وقت سوا
ہے، ایک عدد پناہ گاہ کا۔"

"اوہ ہاں ۔ فرزانہ تم گرنے سے پہلے کچھ کہنے لگی تھیں؟"

"اوہ ہاں ۔ لیکن ابا جان ہو سکتا ہے ۔ وہ میرا وہم ہو۔"

"چلو بتا دینے میں کیا حرج ہے۔" خان رحمان بولے۔

"اچھی بات ہے ۔ میں نے بجلی کی چمک میں اس طرف

ی محل کے آثار دیکھے ہیں۔"

"محل کے ۔ وہ بھی اس بیابان میں ۔ برستی بارش میں ۔
محل کے خواب ۔ حد ہو گئی ۔ تم کوئی چھوٹا موٹا مکان
ہی دیکھ لو تو بڑی بات ہے۔"

"حد ہو گئی ۔ اس وقت چھوٹے بڑے کی کیا بحث ہے،
ہمیں تو بس جگہ چاہیے۔"

"تب پھر ہمیں اس طرف ہی چلنا چاہیے۔" فرزانہ نے
پُر زور انداز میں کہا۔

اور وہ پانی میں شڑاپ شڑاپ کرتے چلنے لگے ۔
بارش ابھی طوفانی انداز میں جاری تھی ۔ قطرے ان کے
سروں پر تال دے رہے تھے ۔ ٹپ ٹپ ٹپاٹپ ۔ ٹپ ٹپ ٹپاٹپ:

"یہ تو ایسا لگتا ہے ۔ جیسے ہمارے سروں پر جلترنگ
ج رہی ہو۔" خان رحمان بولے۔

"ابھی کیا ہے ۔ ابھی تو ہمارے دانت بھی بجیں گے۔"
فرزانہ بولی۔

"تم دانتوں کی بات کرتی ہو ۔ ہمارے تو بجیں گے
باجے۔" فاروق ہنسا۔

"شکر ہے فاروق، تم ہنس تو سکتے ہو۔"

"م ۔ میں ۔ اور کر بھی کیا سکتا ہوں انکل۔" فاروق نے

گھبرا کر کہا۔

"کیوں کیوں — اس میں گھبرانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟"

"سمجھا کریں انکل — مم — مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"اوہ — تو یہ بات ہے۔"

عین اس وقت بجلی ایک بار اور بہت زور سے کڑکی اور ساتھ ہی فرزانہ نے اس محل کو پھر دیکھا — وہ چلائی:

"میں نے محل پھر دیکھا ہے۔"

بوڑھا

"شکر ہے، تم نے محل پھر دیکھا ہے — وہ کتنی دور ہو گا بھلا؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کافی دور نظر آتا ہے — ہمیں چلنا پڑے گا۔" فرزانہ نے جواب دیا۔

"چلنا نہیں تیرنا — آگے پانی اور گہرا ہوتا جا رہا ہے — ہم سڑک کی نسبت نشیب میں جا رہے ہیں — سڑک پر پانی ہمارے گھٹنوں تک تھا — اب پیٹ تک آ گیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں — جب تک چلنا ممکن ہے — ہم چلتے رہیں گے — ورنہ پھر ہم تیرنا شروع کر دیں گے۔"

"ویسے یہ ایڈونچر بھی یاد ہی رہے گا۔" فرزانہ مسکرائی۔

"بھئی کوئی ایڈونچر تو ایسا بھی ہونا ہی چاہیے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں! یہ تو ہے۔"

وہ چلتے رہے — چلتے رہے — آخر جب پانی ان کے
تک آ گیا — تو پھر انھوں نے تیرنا شروع کر دیا — بارش
اب تک بدستور ہو رہی تھی — ایسے میں پروفیسر داؤد بولے:

"ذرا سوچو جمشید، اگر اس محل میں کھانے کے لیے کچھ نہ ہوا؟"

"آپ فکر نہ کریں — محلوں میں بہت کچھ ہوتا ہے۔
آپ فرزانہ کا شکریہ ادا کریں — جس نے کوئی جھونپڑا نہیں
محل دیکھا ہے۔" انھوں نے شوخ آواز میں کہا۔

"کک — کیا آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں ابا جان؟" فرزانہ
جلدی سے پوچھا۔

"تمھارا مذاق بھی کوئی اڑانے کی چیز ہے۔" فاروق نے
منہ بنایا—

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ مذاق صرف تمھارا اڑایا جا
سکتا ہے؟"

"نن — نہیں — میرا یہ مطلب تو خیر نہیں تھا۔"

"جمشید — مجھے ایسے موقعوں کی کچھ مہمات یاد آ رہی ہیں
کیا آج بھی ہمارے ساتھ کوئی چکر چلنے والا ہے؟" خان رحمان
نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ ضروری نہیں۔" وہ بولے۔

"لیکن ابا جان! یہ غیر ضروری بھی تو نہیں۔" محمود مسکرایا۔

"پتا نہیں — اس وقت کیا چیز ضروری ہے اور کیا
غیر ضروری — میں تو صرف ایک بات مانتا ہوں — اور وہ
یہ کہ، ہمارے لیے اس محل تک پہنچنا ضروری ہے۔" انھوں
نے منہ بنایا۔

وہ تیرتے رہے — پورا آسمان بادلوں سے گھرا ہوا
تھا اور اس کی وجہ سے دن کی روشنی بالکل غائب ہو گئی
تھی — انھیں اندھیرے میں ہی تیرنا پڑ رہا تھا — کبھی
کبھی بجلی چمکتی تو انھیں محل کی سمت کا اندازہ ہو جاتا۔
ورنہ شاید وہ محل تک بھی نہ پہنچ پاتے۔

"اوہو — یہاں پانی کم ہو رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے
چونک کر کہا۔

"شاید اونچائی شروع ہو گئی ہے۔"

"ہو سکتا ہے، محل کسی اونچی جگہ یا اونچے ٹیلے پر بنایا
گیا ہو۔"

"چلو اچھا ہے — ہم بھی تیرتے تیرتے تھک گئے ہیں۔"
پروفیسر داؤد نے کہا۔

"اب شاید ہم تیر کر نہ جائیں، لیکن ابھی محل اتنا
نزدیک نہیں ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"کوئی پروا نہیں — جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں

کا کیا ڈر۔"

"اتنے پرانے زمانے کے محاورے نہ بولا کرو یار۔ منہ کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔"

"ہائیں۔ منہ کے ذائقے کی پرانے زمانے کے محاورات سے کوئی دشمنی ہے کیا۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"ہنسانے کی ناکام کوشش نہ کرو۔"

"ان حالات میں کامیاب کوشش کر بھی کیسے سکتا ہوں۔"

"اس بات پر بھی ہنسی نہیں آئی۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"تو تم اپنی ہنسی کی فکر کرو نا۔ ضرور اس میں کوئی خرابی واقع ہو گئی ہے۔"

"کک۔ کس میں؟" پروفیسر داؤد بے خیالی میں بولے۔

"جی۔ وہ ہنسی میں۔ وہ بھی محمود کی ہنسی میں کوئی خرابی واقع ہو گئی ہے۔" فاروق نے معصومانہ انداز میں کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو بھئی۔" پروفیسر داؤد حیرت زدہ رہ گئے۔

"کیوں انکل۔ کیا ہنسی میں خرابی واقع نہیں ہو سکتی؟"

"پپ۔ پتا نہیں۔ خان رحمان سے پوچھو۔" پروفیسر داؤد نے فوراً اپنا دامن چھڑانا چاہا۔

"ہم۔ میں۔ میری معلومات ہنسی کے بارے میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔"

"ایک تو آپ دونوں بھی ان کا پوری طرح ساتھ دینے لگتے ہیں اور یہ مزید سر پر چڑھ جاتے ہیں۔"

"دیکھو بھائی۔ ہم دونوں کو بدنام نہ کرو۔ کم ازکم مزید سر نہ چڑھا کرو۔" خان رحمان گھبرا کر بولے۔

"کم از کم مزید سر نہ چڑھا کرو۔ شاید یہ عجیب ترین جملہ ہے۔"

"ہو گا۔ اس وقت ہم اردو گرامر پڑھنے کے موڈ... ارے۔ وہ رہا محل۔"

"خدا کا شکر ہے۔ وہ رہا محل۔ اگر کہیں تم نے کہا ہوتا، ارے۔ کہاں گیا محل۔ تو ہمارا کیا حال ہوتا۔"

"بس وہی ہوتا جو خدا کو منظور ہوتا۔"

پھر پانی حد درجے کم ہو گیا۔ اگرچہ نیچے پانی ہی پانی تھا، لیکن یہ جگہ چونکہ اونچائی پر تھی۔ اس لیے اب یہاں پنڈلیوں تک پانی تھا۔ اب تیرنے کی بجائے انھیں چلنا پڑا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگے۔ یہاں تک کہ محل ان کے بالکل سامنے آ گیا۔

انھوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس محل کی طرف دیکھا، انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ سنگ مرمر کا محل تھا۔ اور بالکل تاج محل لگ رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا

تھا، جیسے کسی نے تاج محل کی نقل تیار کروائی ہو
کہیں ہم تیرتے تیرتے شارجستان تو نہیں پہنچ گئے۔"

"نن ۔ نہیں ۔ لیکن ۔ یہ سڑک سیدھی شارجستان تک جاتی ہے ۔ بلکہ ہم شارجستان کے اب بہت نزدیک ہیں ۔ گو ہیں اپنے ملک میں ہی۔"

"تو پھر چلیے ۔ آج ذرا شارجستان کی بھی سیر کر آئیں ۔ گھر سے ایڈونچر کے لیے ہی تو نکلے ہیں۔"

"بھئی پہلے اس محل کی تو خبر لے لیں۔" خان رحمان نے منہ بنایا۔

"آپ کچھ غلط نہیں کہ گئے انکل۔"

"غلط ۔ کیسے؟"

"آپ کو دراصل یہ کہنا چاہیے تھا کہ پہلے یہ محل ہماری خبر تو لے لے۔"

"حد ہو گئی ۔ ہر بات کو الٹ کر دینا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔" فرزانہ نے بھنا کر کہا۔

"لیکن جمشید ۔ یہاں تو نہ بندہ نہ بندے کی ذات، ہُو کا عالم طاری ہے۔"

"تو کیا آپ چاہتے ہیں ۔ یہاں ہر طرف لوگ ہمارے استقبال کے لیے کھڑے ملتے ۔ آپ خود غور کریں ۔ اگر یہاں

آبادی ہے تو اس وقت سب لوگ اپنے گھروں میں گھسے ہوئے ہوں گے۔"

"ہوں ۔ تو پھر بسم اللہ کرو ۔ اب تو مجھے بھی سردی محسوس ہونے لگی ہے ۔ پروفیسر صاحب کا تو نہ جانے کیا حال ہو گا۔"

"سردی سے کانپ رہا ہوں۔"

"ابھی تو صرف آپ کانپ رہے ہیں ۔ ابھی لرزنے کی باری بھی آئے گی۔" خان رحمان بولے۔

"وہ کیوں ۔ اب تو ہم محل تک پہنچ گئے ہیں اور اندر آگ وغیرہ کا انتظام ہو جائے گا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔"

وہ اور آگے بڑھے ۔ پھر محمود نے محل کے بڑے اور خوف ناک دروازے پر دستک دی ۔ خوف ناک اس لیے کہ وہ کسی قلعے کے دروازے جیسا تھا ۔ اس میں لوہے کی موٹی میخیں جڑی ہوئی تھیں ۔ تاکہ اس کو کھولنے کے لیے اگر ہاتھی بھی ٹکر ماریں تو ان کے سر زخمی ہو جائیں، لیکن وہ دروازہ نہ کھول سکیں ۔

"یہاں دستک دینے کا بھلا کیا فائدہ ہو گا ۔ رہائشی حصہ اندر نہ جانے کہاں ہو گا ۔ تیز بارش میں آواز اندر کس طرح جائے گی۔"

"جائے یا نہ جائے — کوئی دروازہ کھولنے آئے یا نہ آئے،
ہمیں ہر حال میں اندر داخل ہونا ہے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید
آگے بڑھے اور دروازے پر دستک دی — تین چار منٹ گزر
گئے — لیکن کوئی باہر نہ آیا — انھوں نے پھر دستک دی —
اب بھی کچھ نہ ہوا —

"اوہو — ابا جان — یہ رسی بھی تو لٹکی ہوئی ہے۔"

"اوہ ہاں! یہاں رسی بلا وجہ نہیں ہو سکتی۔"

انھوں نے چونک کر کہا اور پھر رسی پکڑ کر کھینچ دی — انھیں
اندر کسی قسم کی کوئی آواز سنائی نہ دی، پھر بھی وہ کھڑے
انتظار کرتے رہے:

"مجھے تو ایسا لگتا ہے — جیسے یہ دروازہ نہیں کھلے گا اور
ہم یہاں کھڑے سوکھ جائیں گے۔"

"خیر — اس بارش میں سوکھنے سے تو رہے — ہاں یہ کہا
جا سکتا ہے کہ نمونیے سے مر جائیں گے۔"

"لیکن جمشید — مم — میری بھوک کا کیا بنے گا — میں تو
بھوکے پیٹ مرنا بھی پسند نہیں کروں گا۔" پروفیسر داؤد نے
گھبرا کر کہا۔

اور ان کی ہنسی نکل گئی، لیکن پھر فوراً ہی ان کی ہنسی
رک گئی، کیونکہ عین اس وقت انھوں نے محل کا بھاری

دروازہ تیز چرچراہٹ کے ساتھ کھلتے دیکھا —

وہ یک دم خاموش ہو گئے — ان کی نظریں دروازے
پر جم گئیں — دروازہ بہت آہستہ آہستہ کھل رہا تھا —
آخر وہ اتنا کھل گیا کہ اس میں سے ایک آدمی نکل سکے
یا اندر جا سکے، پھر پہلے ایک سر نظر آیا — ایک بہت
بوڑھا سر — اس کے بعد اس بوڑھے کا باقی ماندہ جسم
بھی دروازے سے نکل آیا — اب وہ پورا ان کے سامنے
کھڑا تھا اور اس طرح پلکیں جھپکا رہا تھا — جیسے جاگتے میں
کوئی خواب دیکھ رہا ہو —

تازہ بھوت

"آپ — آپ کون لوگ ہیں اور اس طرف کیسے آنکلے؟"
اس کے لہجے میں زمانے بھر کی حیرت تھی۔
"کیوں! کیا اس طرف نکل آنا کوئی ناممکن بات ہے"
انسپکٹر جمشید نے ایک قدم آگے بڑھایا۔
"یہ بات نہیں — لوگ اس محل کا رُخ نہیں کرتے —
وہ اس سے اس طرح ڈرتے ہیں، جیسے کسی جن، بھوت یا
چڑیل سے ڈرتے ہیں۔"
"کیا یہاں آس پاس کوئی آبادی بھی موجود ہے؟"
"ہاں! اس محل سے دو کلو میٹر دُور اچھی بھلی آبادی ہے،
لیکن اس آبادی کے لوگ اس محل کا رُخ نہیں کرتے۔"
"آخر کیوں؟"
"پہلے آپ اپنی سنائیں۔"
"ہم اس محل کے سامنے سڑک سے گزر رہے تھے

کہ بارش کے طوفان نے آگھیرا — یہاں تک کہ ہماری
گاڑی رک گئی — اور ہمیں تیر کر اور چل کر یہاں تک
آنا پڑا — بجلی کی چمک میں ہمیں یہ محل نظر آیا تھا۔"
"اوہ — لیکن سڑک پر سے تو یہ محل نظر نہیں آتا —
آج تک کسی کو نظر نہیں آیا — یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"
"کیا مطلب؟" وہ حیران رہ گئے۔
"یہ محل سڑک سے ہرگز نظر نہیں آتا — چاہے آپ بارش
رکنے پر سڑک پر جا کر تجربہ کر لیں۔"
"سڑک پر تو خیر ہمیں جانا ہو گا — اس لیے کہ آخر
ہمیں یہاں سے جانا ہے اور وہاں کہیں ہماری کار بھی
موجود ہے۔" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا، پھر بولے:
"خیر — ان سب باتوں کو چھوڑیں — اس وقت تو
ہمیں پناہ کی ضرورت ہے — آپ یہ بتائیں، ہمیں پناہ
ملے گی یا نہیں۔"
"ملنے کو تو یہاں ہر چیز مل سکتی ہے، لیکن آپ ٹھہر
نہیں سکیں گے — اس محل میں پوری ایک رات آج
تک کوئی نہیں رہ پایا۔"
"چلیے — آپ کو اس بات کا تجربہ بھی ہو جائے گا۔"
"کیا مطلب — آپ میری باتیں سن کر ڈرے نہیں۔"

"ابھی تک تو ڈرنے کی کوئی بات نظر نہیں آئی۔" فا
نے کہا۔

"آجائے گی، لیکن پھر مجھے الزام نہ دیجیے گا۔ مَیں
آپ کو پہلے ہی خبردار کر دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، لیکن پہلے آپ بتائیں۔ آپ کون ہیں۔
محل سے آپ کا کیا تعلق ہے؟"

"میں اس محل کا چوکیدار ہوں۔ برسوں پرانا چوکیدا

"اور اس محل کا مالک کون ہے؟"

"سیٹھ امر سنگھ۔" اس نے کہا۔

"کیا مطلب! کیا محل کسی سکھ نے بنوایا تھا؟"

"ہاں! اس نے یہ محل اپنی بیوی کے لیے بنوایا تھا
اس کی بیوی اس محل میں دفن ہے۔ اسے اپنی بیوی
بہت محبت تھی، لیکن نوجوانی کے عالم میں ہی ایک بلن
سے گر کر ہلاک ہو گئی۔ اس نے اس جگہ جہاں ا
وقت محل ہے، اپنی بیوی کو دفن کرا دیا۔ پھر آس پ
کی جگہ خرید کر یہ محل بنوایا۔ سنا ہے، اس روز
اس محل میں اس کی بیوی کی رُوح آتی ہے۔ وہ سرگو
کرتی ہے۔ باتیں کرتی ہے۔ لہٰذا یہاں کوئی نہیں ٹک
یہاں تک کہ اس کی اولاد بھی یہاں نہیں ٹک سکی۔ تنہ

میں انھوں نے اس محل کو آباد کرنے کی بہت کوشش
کی، لیکن آباد نہ کر سکی۔ ان سرگوشیوں نے انھیں
ٹکنے نہ دیا۔ اس دن کے بعد سے آج تک یہاں
کوئی پوری ایک رات نہیں گزار سکا۔" یہاں تک کہ کر
وہ خاموش ہو گیا۔

"چلیے۔ ہمیں تو مجبوری ہے۔ یہ ایک رات یہاں گزارنا
ہو گی۔"

"لیکن اگر آپ میں سے کسی کا ہارٹ فیل ہو گیا تو میرا
ذمہ نہیں ہو گا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ ہم اپنے دل پہلے ہی باہر چھوڑ
دیں گے۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"اور کسی ڈاکٹر سے ان کو پاس بھی کروا لیں گے۔"

"آپ شاید اس کہانی کو مذاق خیال کر رہے ہیں۔ لیکن
ایک بات خود میری سمجھ میں بھی نہیں آ سکی۔ کہ آپ لوگوں
کو یہ محل سڑک پر سے نظر کس طرح آ گیا۔"

"ہم میں سے ایک فرد کی نظریں بہت تیز ہیں۔"

"یہاں معاملہ تیز اور کمزور نظر کا نہیں۔ سڑک سے یہ
محل نظر آ ہی نہیں سکتا۔ درمیان میں ٹیلے ہیں۔ درخت ہیں
اور بھی نہ جانے کیا کیا رکاوٹیں ہیں۔ اس لیے محل نظر

نہیں آتا — اگر ایسا نہ ہوتا تو یہاں آئے دن لوگ پناہ لینے
کے لیے آ جایا کرتے ، لیکن پچاس سال کے عرصے میں
آپ پہلے آدمی ہیں — جو یہاں آئے ہیں — ورنہ یہاں
طوفان تو عام طور پر آتے رہتے ہیں اور ان طوفانوں
میں لوگوں کی گاڑیاں سڑک پر پھنستی ہی رہتی ہیں اور
ہم خود جا جا کر ان کی گاڑیاں نکلواتے ہیں — لیکن یہ محل
کسی کو نظر نہیں آتا — نہ ہم کسی کو اس طرف آنے کی
دعوت دیتے ہیں — دعوت دے بھی کیسے سکتے ہیں —
جب یہاں کوئی ٹک ہی نہیں سکتا۔"

"اب ہم کھڑے کھڑے بہت تھک گئے ہیں — کیا ہم
بیٹھ کر باتیں نہیں کر سکتے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"جی ضرور — کیوں نہیں — آئیے — میں آپ کو اپنے
کمرے میں لے چلتا ہوں — میرا مشورہ آپ کو یہی ہے
کہ آپ یہ رات میرے کمرے میں گزاریں — وہاں آپ
کو کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔"

"اس پر ہم بعد میں غور کریں گے — سوال یہ ہے
کہ سیٹھ امر سنگھ کی اولاد نے آپ کو یہاں کیوں رکھا ہوا
ہے — جب کہ اس محل کی حفاظت کی کوئی ضرورت نہیں —
جب یہاں ایک رات سے زیادہ کوئی نہیں ٹھہرتا تو اس کی

حفاظت کی بھی کیا ضرورت ہے ؟ اس سوال کا کیا جواب
ہے آپ کے پاس۔"

"دوسروں کے لیے۔" وہ مسکرایا۔

"دوسروں کے لیے؟" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں ! تاکہ بھولے بھٹکے لوگ آ کر اسے خالی سمجھ کر اس
میں ڈیرہ نہ جما لیں اور آسیب کے چکر میں نہ پڑ جائیں۔"

"بہت خوب ! تب تو امر سنگھ کی اولاد بہت اچھے خیال
کی مالک ہے — اس وقت اس گھرانے کا ذمے دار فرد کون ہے؟"

"گنڈا سنگھ۔" اس نے بتایا۔

"اور وہ قصبے میں رہتا ہے؟"

"آپ اس کو قصبہ تو خیر نہیں کہہ سکتے — گاؤں کہہ لیں —
گاؤں بھی ایسا — جس کا زیادہ تر حصہ گنڈا سنگھ کی ملکیت
ہے — آس پاس کی تمام زمینیں اور مکانات انھی کے
ہیں — لوگ یا تو ان کے مزارعے ہیں — یا پھر کرائے دار۔"

"اوہو اچھا۔" وہ حیران رہ گئے۔

"ہاں ! امر سنگھ کی دولت بے اندازہ تھی — اور ہمیشہ اس
کی دولت میں اضافہ ہی ہوتا رہا — وہ زمینوں پر زمینیں خریدتا
چلا گیا — اور اب قریباً پورا گاؤں اس کا ہے — اس میں
اس کے اپنے مذہب کے لوگ ہی زیادہ ہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے ۔ یہ گاؤں سکھوں کا ہے۔"

"ہاں ! لیکن وہاں چند گھرانے مسلمانوں کے بھی ہیں ۔ اور ان کے پاس گھر بھی ان کے اپنے ہیں ۔ انھوں نے امر سنگھ کے ہاتھوں اپنی جائیداد فروخت نہیں کی تھی ۔ امر سنگھ نے بھی زبردستی ان کی زمین خریدنے کی کوشش نہیں کی۔"

"بہت خوب ! اب آپ ہمارا فیصلہ سُنیں ۔ ہم رات اسی محل میں گزاریں گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"یہ ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ۔ یہ تمام باتیں سُننے کے بعد۔"

"ہاں ! ہمیں بھوت پکڑنے کا بہت شوق ہے۔"

"کیا کہا ۔ بھوت پکڑنے کا شوق۔" اس نے مارے حیرت کے آنکھیں باہر کو نکالیں۔

"ہاں ! بھوت پکڑنے کا ہمیں بہت شوق ہے ۔ اگر ہم اس محل کو بھوتوں یا رُوحوں سے پاک کر دیں تو آپ ہمیں کیا انعام دیں گے؟"

"میں بھلا کیا انعام دے سکتا ہوں ۔ انعام تو دیں گے گنڈا سنگھ۔"

"چلیے خیر ۔ ہم انعام ان سے ہی لے لیں گے ۔ اور

بات طے کیے بغیر ہی لے لیں گے ۔ پہلے یہ بتائیں ، کچھ کھانے کو ملے گا یا نہیں؟

"میں نے اپنے لیے جو چیزیں یہاں رکھی ہوئی ہیں، ان سے روکھی سوکھی تیار کر سکتا ہوں۔"

"آپ کا بہت احسان ہو گا۔"

"اس میں احسان کی کیا بات ہے بھلا۔"

"ارے ہاں ! یہ بتائیں ۔ کیا آپ بھی سکھ ہیں؟"

"ہاں ! میں بھی سکھ ہوں۔"

"تب آپ خشک چیزیں ہمیں دکھا دیں ۔ تیار ہم خود کر لیں گے۔"

"آپ تیار کریں گے ۔ اوہ ہاں ! میں دیکھ رہا ہوں ۔ یہ بچّی بھی آپ کے ساتھ ہیں ۔ تو آئیے ۔ میں آپ کو محل کے باورچی خانے میں لے چلتا ہوں۔" اس نے فرزانہ کی طرف دیکھا۔

"چلیے۔" فرزانہ نے کہا اور اس کی طرف بڑھی۔

"یہ کیا ۔ آپ اکیلی جائیں گی ۔ آپ کو ڈر نہیں لگے گا؟"

"لیکن ڈر کس بات کا؟" فرزانہ مسکرائی۔

"آسیب کا ۔ رُوح کا ۔ بھوت کا ، چڑیل کا۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"ان میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں - جن سے ہمیں
لگتا ہو - ہم صرف اور صرف ایک سے ڈرتے ہیں"

"صرف اور صرف ایک سے - کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہم صرف اپنے اللہ سے ڈرتے ہیں"

"ویسے میں مدد کے لیے فاروق کو ساتھ لے جاتی ہ

"مجھے کھانا پکانے کا کوئی تجربہ نہیں" فاروق بولا۔

"اور نہ مجھے" محمود نے فوراً کہا۔

"چلو فرزانہ - میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں"

"تو ہم سبھی فرزانہ کے ساتھ کیوں نہ چلیں - جو چیز
تیار ہو گی - ساتھ ساتھ کھا تو سکیں گے" پروفیسر داؤد نے
گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کم از کم آپ کے یہ ساتھی ضرور ڈر رہے ہیں" چوکید
نے کہا۔

"نہیں - یہ جنوں سے نہیں، بھوک سے ڈر رہے ہیں۔
ویسے آپ کا نام کیا ہے؟"

"میں رُوپ سنگھ ہوں"

"بہت خوب - آئیے چلیں"

باورچی خانے میں انھوں نے خشک چیزیں اس سے
لے کر کھانا تیار کیا - اس روز باقی لوگوں کو یہ بات معلوم

ہوئی کہ انسپکٹر جمشید کھانا پکانے میں بھی بہت ماہر تھے - انھوں
نے اس قدر مزے دار چیزیں تیار کیں کہ وہ انگلیاں چاٹتے
رہ گئے - خود رُوپ سنگھ کا مارے حیرت کے بُرا حال تھا:

"کمال ہے، میں بھی آخر انھی چیزوں سے کھانا تیار کرتا
رہا ہوں، لیکن اتنا مزا کبھی نہیں آیا"

"تو کیا خیال ہے - آپ ہمیں اس محل میں بطور باورچی
رکھ لیں"

"یہ - یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"چلیے خیر - جانے دیں اس بات کو - اور اب ذرا ہمیں
پہلے اس محل کی سیر کرا دیں - پھر ہمیں وہ کمرے دکھا دیں،
جس میں ہم رات گزار سکیں"

"ٹھیک ہے - آئیے"

وہ انھیں باری باری کمرے اور دوسری چیزیں دکھاتا ہوا
آگے بڑھتا چلا گیا:

"آخر آپ کو یہاں ڈر کیوں نہیں لگتا؟"

"میں اس حصے میں داخل ہی نہیں ہوتا - جہاں بھوت
نظر آتے ہیں"

"تو کیا بھوت محل کے صرف کچھ حصے میں نظر آتے ہیں؟"

"نہیں - پورے محل میں ہی نظر آ سکتے ہیں - یہ تو بھوتوں

کی مرضی کی بات ہے۔"

"ایک طرف آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ محل کے اس حصّے کی طرف نہیں جاتے — اور اب کہہ رہے ہیں کہ ہر جگہ وہ نظر آسکتے ہیں۔"

"ہاں! میں نے غلط نہیں کہا — ان کا خاص مقام اندرونی کمرہ ہے، لیکن جب وہ غصّے میں ہوتے ہیں تو پورے محل میں نظر آتے ہیں — کم از کم مجھ سے وہ مانوس ہیں۔ جانتے ہیں — میں انھیں کچھ نہیں کہتا — اس لیے وہ مجھے کچھ نہیں کہتے۔"

"اچھا خیر — آپ محل دکھائیں۔"

محل میں بیس کے قریب کمرے تھے — محل دو منزلہ تھا — انھوں نے اوپر والی منزل بھی دیکھی اور نیچے والی بھی — نیچے دس کمرے تھے اور ان کے اوپر دس کمرے تھے — برامدے تھے — ایک بڑا صحن تھا — لیکن صحن کے بیچوں بیچ ایک کمرہ تھا — عجیب ترین کمرہ — وہ اس کے سامنے رک گئے — بلکہ پہلے چکر کاٹا، پھر رکے:

"یہ کیا — اس کمرے کا تو کوئی دروازہ ہی نہیں ہے۔"

"ہاں! امر سنگھ کی بیوی اس کمرے میں دفن ہے — اس نے اسے چاروں طرف سے بند کروا دیا تھا — کوئی دروازہ

نہیں چھوڑا تھا — یہ اوپر سے بھی بالکل بند ہے اور چاروں طرف سے بھی۔"

"اوہ — گویا جب سے امر سنگھ کی بیوی کو یہاں دفن کیا گیا ہے — اس کے بعد سے اب تک اس کمرے کو اندر سے کسی نے نہیں دیکھا۔"

"کم از کم میں نے تو نہیں دیکھا — میرے باپ نے بتایا تھا کہ انھوں نے بھی نہیں دیکھا تھا — البتّہ۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"البتّہ کیا؟"

"البتّہ انھوں نے بتایا تھا کہ مرنے سے کچھ عرصہ پہلے وہ اپنی بیوی کی یاد میں بہت بے چین رہنے لگے تھے — لہٰذا انھوں نے دیوار تڑوا کر اندر جا کر قبر کے پاس کچھ وقت گزارا تھا — بس اس کے بعد اس کمرے کو بند ہی دیکھا گیا۔"

"گویا باہر نکل کر امر سنگھ نے دیوار پھر چنوا دی تھی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں بالکل۔"

"شکریہ — اب ہم تمام محل دیکھ چکے — آپ ہمیں صرف رہائشی کمرے دکھا دیں۔"

"آپ کسی بھی کمرے میں رہ لیں، لیکن میرا مشورہ ہے،

اس قبر والے کمرے کے آس پاس نہ آئیں ۔ اور میں
اب بھی یہ مشورہ دوں گا کہ اندر نہ رہیں ۔ میرے سا
گاؤں چلیں ۔ وہاں آپ کے لیے انتظام کر دیا جا
گا ۔ صبح آپ کی کار تک آپ کو پہنچا دیا جائے گا۔“

”شکریہ! ہم یہیں رہنا پسند کریں گے ، اس لیے کہ
بتا چکے ہیں ۔ ہم بھوت پکڑنے کے بہت شوقین ہیں۔“

”آخر آپ نے کتنے بھوت پکڑے ہیں اب تک؟“

”بس پوچھیے نا ۔ ان گنت“۔ فاروق مسکرایا۔

”اور وہ بھوت ہیں کہاں؟“

”آپ دیکھنا پسند کریں گے؟“

”ہاں! کیوں نہیں۔“

”تو آج رات یہیں ٹھہر جائیں ۔ تازہ بھوت ہی دیکھ لیجیے
گا ۔ ہم تو آج تک جتنے پکڑ چکے ہیں ، وہ باسی ہو چکے ہیں“

”باسی بھوت ۔ بھئی واہ ۔ یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے“

”جی کیا مطلب؟“ روپ سنگھ نے حیران ہو کر کہا۔

”ان کی بہت سی باتوں کے مطلب دوسروں کی سمجھ
میں نہیں آتے۔“

”میں تو اب باہر جاؤں گا ۔ اندر ڈر لگ رہا ہے۔“

”لیکن یہاں کے بھوت تو آپ سے مانوس ہیں؟“

”مانوس ضرور ہیں ، لیکن کیا پتا ۔ کب ان کی مانوسیت
ختم ہو جائے۔“

”آپ کا کمرہ کون سا ہے؟“

”میں رات کو اس محل کے اندر نہیں سوتا ۔ اپنے کوارٹر
میں رہتا ہوں ۔ اور میرا کوارٹر محل سے باہر پچھلی طرف ہے۔“

”اچھی بات ہے ۔ آپ جائیں ۔ محل کا بیرونی دروازہ ہم
بند نہیں کرنا چاہتے ۔ نہ جانے کب ہمیں باہر آنے جانے
کی ضرورت پڑ جائے۔“

”اچھی بات ہے ۔ میں دروازہ بند نہیں کروں گا ۔ ویسے
بیرونی دروازہ میں عام طور پر باہر سے بند ہی رکھتا ہوں۔“
اس نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

”ہم حیران ہیں ۔ آپ کیوں ڈر رہے ہیں ۔ اور اگر آپ
کو یہاں ڈر لگتا ہے تو آپ یہاں رہ کس طرح رہے ہیں“

”باہر رہ کر میں بالکل ٹھیک رہتا ہوں ، لیکن جب
بھی اندر آتا ہوں ۔ ڈر لگنے لگتا ہے ۔ دراصل دن کے وقت
یہاں ڈر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی ۔ ڈر صرف رات کو
لگتا ہے۔“

”اور اب رات ہونے والی ہے“۔ محمود نے سرسراتی آواز
میں کہا۔

"کم از کم آواز کو تو خوف ناک نہ بناؤ۔" فاروق نے گ
نے کہا۔

"ٹک ۔ کیوں ۔ ڈر لگ رہا ہے تمہیں"؛ فرزانہ نے ل
آواز منہ سے نکالی۔

"آپ لوگ تو گزار چکے یہاں رات ۔ آپ تو ابھی ۔
ڈر رہے ہیں ۔ جب کہ ابھی تمام رات پڑی ہے۔"

"آپ سمجھے نہیں ۔ ہم ڈرنے کی مشق کر رہے ہیں۔"

"کیا کہا ۔ ڈرنے کی مشق۔" اس کے منہ سے مارے ج
کے نکلا۔

ساتھ ہی اس کے منہ سے ایک دل دوز چیخ نکل گئی۔

کیا!!!

فوراً ہی وہ نیچے بیٹھ گیا اور اپنے پاؤں کو پکڑ کر زور زور سے تڑپنے لگا:

"مر گیا ۔ ہائے ۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"کیا ہو رہا ہے ۔ ہمیں تو کچھ نظر نہیں آ رہا ۔ کچھ ہمیں دکھائیں بھی تو۔" فاروق بولا۔

"کیا دکھاؤں ۔ میرے پاؤں کو کوئی نوچے ڈال رہا ہے، یوں جیسے کوئی مگرمچھ چبا رہا ہو ۔ بس ایسی ہی تکلیف میں محسوس کر رہا ہوں۔" اس نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

"لیکن آپ کا پاؤں بالکل ٹھیک ہے ۔ کہیں کوئی خون وون نہیں ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اس سے کیا ہوتا ہے ۔ میری جان نکلی جا رہی ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے ۔ ہم آپ کو اٹھا کر محل سے باہر لے چلتے ہیں۔"

انسپکٹر جمشید نے یہ کہہ کر اسے اٹھایا اور باہر کی طرف
لے چلے ، وہ اسی طرح چیختا چلاتا رہا اور پھر وہ باہر نکل
آئے ۔ جونہی اسے باہر لایا گیا ۔ اس کا چیخنا چلانا بند
ہو گیا ۔

"کیا تکلیف رفع ہو گئی ؟"

"ہاں ! باہر نکلتے ہی تکلیف ختم ہو گئی ۔ ذرا میں اپنے
پیر دیکھ لوں ۔"

وہ نیچے بیٹھ گیا اور اپنے دونوں پیر اچھی طرح دیکھنے
لگا ۔ ان پر کہیں کوئی زخم نہیں تھا :

"حیرت ہے ۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا رہا ہے جیسے یہ
چھلنی ہو چکے ہوں ۔" وہ بڑبڑایا ۔

"کیا پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے ؟"

"نہیں ۔ یہ پہلا موقع ہے ۔ شاید اس لیے کہ میں آپ
لوگوں کو محل میں رہنے کی اجازت دے رہا ہوں ۔ میری
مانیے ۔ گاؤں چلے چلیے ۔ وہاں آپ سکون میں رہیں گے ۔"

"اچھی بات ہے ۔ ہم آپ کو پریشانیوں میں مبتلا
نہیں کریں گے ۔ گاؤں چلے جاتے ہیں ۔"

"میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں ۔ راستا دشوار گزار ہے ۔"

"ہم ایسے راستوں کے عادی ہیں ۔"

"لیکن راستے میں پانی ہی پانی ہو گا ۔"

"کوئی بات نہیں ۔ ہمیں تیرنا آتا ہے ۔"

"آپ مجھے ساتھ لے جانا کیوں پسند نہیں کرتے ؟"

"ہم اپنی وجہ سے دوسروں کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتے ۔"

"آپ میری تکلیف کی پروا نہ کریں ۔ میں چاہتا ہوں ۔
آپ حفاظت سے گاؤں تک پہنچ جائیں ۔ وہاں میں آپ
کو سیٹھ گنڈا سنگھ کے حوالے کر دوں گا ۔ وہ آپ کے آرام
کا پوری طرح انتظام کر دیں گے ۔"

"نہیں ۔ ہم آپ کو ساتھ نہیں لے جائیں گے ۔ جائیں
گے تو خود جائیں گے ۔ ورنہ ہمیں یہیں رہنے دیں ۔ رہے
آپ ۔ آپ اندر ہرگز نہ جائیں ۔"

"جیسے آپ کی مرضی ۔ آپ شاید دوسروں کی بات ماننے
کے عادی نہیں ہیں ۔" اس نے برا سا منہ بنایا ۔

"ہاں ! آپ کا اندازہ درست ہے ۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے ۔
اور وہ برا سا منہ بنا کر اپنے کوارٹر کی طرف چلا گیا ۔

"یہ آپ نے کیا فیصلہ کیا ابا جان ۔ ہم تو دیکھنا چاہتے
ہیں ۔ اس محل میں ہے کیا ۔"

"کوئی بات نہیں ۔ دن میں بھی دیکھ سکتے ہیں ۔" انھوں
نے مسکرا کر کہا ۔

"لیکن بھوتوں سے تو صرف رات کو ملاقات ہو سکتی ہے"
نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"تو ان سے ملاقات کرنا کیا ضروری ہے" فاروق بولا۔

"ہاں! ذرا مزا رہتا"

"بارش کے طوفان میں گھر کر کیا مزا نہیں رہا۔ کمی رہ گ
مزے میں"

"ہاں! بالکل رہ گئی کمی"

"آؤ چلیں۔ اب یہاں ٹھہر کر وقت کیوں ضائع کریں"

عین اس وقت بارش ایک بار پھر موسلا دھار شروع ہو گئی

"اب دکھائیں جا کر" محمود ہنسا۔

"ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے ہمیں یہ رات محل میں ہی گ
ہو گی" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"تو پھر۔ اب یہاں کھڑے رہ کر بھی کیا کریں گے۔ آ
اندر چلیں"

وہ اندر کی طرف بڑھے۔ بیرونی دروازہ انھوں نے کھلا
چھوڑ دیا۔

"اس محل میں سب سے زیادہ پُر اسرار وہ بند کمرہ ہے
جس میں کوئی دروازہ نہیں دکھا گیا۔ میں اس کو اندر سے
دیکھنا چاہتا ہوں"

"ارے باپ رے" فاروق نے لرز کر کہا۔

"اگر تمہیں اتنا ہی ڈر لگ رہا ہے تو تم گاؤں چلے جاؤ" فرزانہ
نے جھلا کر کہا۔

"اکیلا تو ہرگز نہیں جاؤں گا، کیونکہ اس صورت میں یہاں
سے زیادہ ڈروں گا"

"تم نے ڈرنے کا ٹھیکا تو نہیں لے لیا"

"نہیں۔ سوچ رہا ہوں" فاروق نے کہا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"یہ کہ ٹھیکا لے ہی لوں"

عین اُس لمحے بانسری کی آواز ان کے کانوں میں گونجنے لگی:

"فاروق! یہ کیا مذاق ہے" محمود اس کی طرف مڑا۔

"کک۔ کہاں؟"

"تم منہ سے بانسری کی آواز کیوں نکال رہے ہو؟"

"دماغ تو نہیں چل گیا" فرزانہ نے تلملا کر کہا۔

"یہاں یہ بات عجیب تو نہیں ہو گی" فاروق نے مسکرا
کر کہا۔

"کیا مطلب۔ کون سی بات؟" خان رحمان کے لہجے میں
حیرت تھی۔

"یہ کہ میرا دماغ چل جائے"

"آخر یہ بانسری کی آواز کہاں سے آ رہی ہے؟" پروفیسر داؤد بڑبڑائے۔

"محل سے"۔ فاروق نے فوراً کہا۔

"آواز ہر طرف سے آتی محسوس ہو رہی ہے، لہٰذا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا"۔

آواز آہستہ آہستہ تیز ہونے لگی۔ پھر انھیں یوں لگنے لگا جیسے وہ ان کے کانوں کے پردے پھاڑ کر رکھ دے گی۔ انھیں اپنے روئیں روئیں میں یہ آواز گھستی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بار بار چاروں طرف گھوم رہے تھے، لیکن یہ اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کہ آواز کس طرف یا کس سوراخ سے آ رہی ہے۔

"یہ آواز تو کر دے گی ہمیں پاگل"۔ پروفیسر داؤد نے گھبرا کر کہا۔

"صبر اور سکون سے کام لیں۔ کانوں میں انگلیاں اچھی طرح ٹھونس لیں"۔ انسپکٹر جمشید نے کہا۔

انھوں نے ایسا ہی کیا۔ کانوں میں انگلیاں پوری طرح ٹھونسنے کے بعد آواز قدرے مدھم ہو گئی، لیکن پھر شاید اسی حساب سے آواز اور تیز ہو گئی۔ اور انھیں اپنے دماغوں کی رگیں پھٹتی محسوس ہونے لگیں۔

"جمشید! اب یہ آواز میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی ہے"۔

"تو آئیے۔ ہم آپ کو محل کے باہر چھوڑ آئیں"۔ انسپکٹر جمشید نے پروفیسر داؤد سے کہا۔

"کک۔ کیا مطلب۔ کیا تم ان حالات میں بھی اندر ہی رہو گے؟"

"مجبوری ہے۔ اس آواز کا راز تو جاننا ہو گا"۔ انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ مجھے اپنے دماغ میں اس آواز کی دھمک کسی بم کی ٹھک ٹھک سے بھی کہیں زیادہ بری محسوس ہو رہی ہے۔ لہٰذا میں نہیں ٹھہر سکتا۔ اگر ٹھہرا تو میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی"۔

"اللہ نہ کرے۔ آئیے۔ میں آپ کو روپ سنگھ کے کوارٹر تک پہنچا دیتا ہوں"۔

"لیکن جمشید! اس طرح تو روپ سنگھ ہمارا مذاق اڑائے گا"۔

"ہمیں مذاق کی پروا تو خیر نہیں کرنی چاہیے۔ کوئی اڑاتا ہے تو اڑاتا رہے۔ اکثر لوگ دوسروں کا مذاق نظر بچا بچا کر اڑاتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ

جس کا مذاق وہ اڑا رہے ہیں ، وہ سب جانتا ہے ، سمجھتا
ہے ، لیکن انجان بن جاتا ہے — اور وہ کر بھی کیا سکتا
ہے — لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ مذاق اڑانے والے
زیادہ نقصان میں رہتے ہیں — بڑھاپے میں پھر ان کا
وہ مذاق اڑتا ہے کہ انھوں نے دوسروں کا خواب میں
بھی اتنا مذاق نہیں اڑایا ہوتا۔"

"یہ تو خیر آپ نے بالکل ٹھیک کہا — ہم نے بھی ایسے
بہت سے لوگ دیکھے ہیں۔"

"بہرحال ہم وہاں اس لیے نہیں جانا چاہتے کہ ہمارا
وہاں مذاق اڑایا جائے گا — بلکہ ہم اس لیے نہیں جائیں
گے کہ اس محل کا جائزہ لینا ہے — فی الحال تو بانسری
کی آواز سے چھٹکارا پانا ہے۔"

"کیا یہ بھوت لوگ بانسری بجا بجا کر لوگوں کو یہاں سے
بھگا دیتے ہیں — یہ تو بہت آسان طریقہ ہے — نہ ہینگ لگے ، نہ
پھٹکری ، رنگ چوکھا آئے۔"

"صرف محل سے بھگانے کے لیے تو بانسری کی یہ آواز
بھی بہت ہے — لیکن اگر کوئی دلیر قسم کے لوگ آ جاتے ہوں
گے تو ان کے لیے بھوتوں نے اور بھی چیزیں تیار کر رکھی ہوں گی۔"

"پتا نہیں ، بھوت بھائی کیا چکر چلا رہے ہیں؟"

آخر وہ دروازے تک پہنچ گئے اور پھر انہیں ٹھٹک کر
رک جانا پڑا — دروازہ انھوں نے کھلا چھوڑ دیا تھا —
لیکن اب دروازہ برابر ہو چکا تھا — محمود جلدی سے آگے
بڑھا — اور اس کا ہینڈل پکڑ کر کھینچا — اس کا ہاتھ وہاں
چپک کر رہ گیا :

"کیا ہوا — گوند لگا ہوا ہے —— اس پر شاید۔"

"نہیں — دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا ہے۔"

"کیا !!!" وہ ایک ساتھ بولے —

آواز کی تہ

انسپکٹر جمشید لپک کر آگے بڑھے اور دروازہ کھولنے کے لیے زور لگایا، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا:

"مجھے افسوس ہے پروفیسر صاحب۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ مسکرائے۔

"اب آپ کو بانسری کی آواز برداشت کرنا پڑے گی۔"

"کیوں نہ ہم چھت پر جا کر دیکھیں۔"

"چلیے — ایسا بھی کر لیتے ہیں۔"

وہ محل کی چھت پر آئے — یہاں بھی بانسری کی آواز گونج رہی تھی — بلکہ یہاں نیچے سے بھی زیادہ تیز تھی — نیچے اُترنے کے لیے کوئی پائپ بھی نہیں تھا — لہٰذا مجبوراً انھیں نیچے لوٹنا پڑا — محل میں باہر نکلنے کا کوئی اور دروازہ نہیں تھا — کھڑکیوں میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں، لیکن وہ کھڑکیاں بھی محل کے باہر کی طرف نہیں کھلتی تھیں۔

"اگر ہم سلاخیں کاٹ بھی دیں تو بھی محل سے باہر نہیں جا سکتے۔" انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی کہا۔

"لیکن ہم ایسا کیوں نہ کریں — محمود کے چاقو سے دروازہ کاٹ ڈالیں۔"

"بات ٹھیک ہے — اگرچہ ہمارا باہر جانے کا کوئی پروگرام نہیں ہے، لیکن پروفیسر صاحب کو اس آواز سے نجات دلوانے کے لیے ایسا کرنا پڑے گا — آؤ۔"

وہ ایک بار پھر دروازے کی طرف آئے:

"محمود چاقو نکالو۔"

محمود چاقو نکالنے کے لیے جھکا اور پھر جھکا کا جھکا رہ گیا —

"اب کیا ہو گیا — جو کام کرنے لگتے ہو — درمیان میں چھوڑ دیتے ہو۔"

"ایڑی چاقو میں نہیں ہے۔" محمود نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"ایڑی چاقو میں ہو بھی نہیں سکتی۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"مطلب یہ کہ چاقو ایڑی میں نہیں ہے — شاید تیرتے ہوئے ایڑی کھل گئی اور وہ پانی میں گر گیا۔"

"لیجیے پروفیسر انکل — آپ کے لیے ایک اور کام نکل

آیا۔ اب آپ کو ایک بار پھر چاقو بنانا پڑے گا۔"

"یہ بہت بُرا ہوا۔ اس قسم کا چاقو بنانا کوئی آسان کام نہیں۔ اس میں بہت وقت لگتا ہے اور پھر سرمایہ بہت صَرف کرنا پڑتا ہے۔ مختلف دھاتوں کو پگھلانا پڑتا ہے۔ پھر ان دھاتوں میں نہ جانے کتنے ہی کیمیائی مادے ملانا پڑتے ہیں۔ تب کہیں جا کر ایک چاقو بنتا ہے۔ محمود۔ یار تم اس کو رکھنے کی اب جگہ بدل دو۔"

"جی بہتر! اس پر بھی غور کر لیں گے، لیکن دیکھا جائے تو مجھے یہی جگہ پسند ہے۔"

"خیر۔ اب کیا کریں؟"

"صبر۔ آپ کے کانوں میں انگلیاں میں ٹھونس دیتا ہوں۔" فاروق مسکرایا۔

"نن۔ نہیں۔" وہ گھبرا گئے۔

"کیوں انکل۔ اس میں گھبرانے کی کیا ضرورت۔"

"پتا نہیں۔ تم کہاں تک کانوں میں انگلیاں ٹھونسو گے۔ کہیں میں ہمیشہ کے لیے بہرہ ہو گیا تو۔"

انھیں ہنسی آ گئی۔ ادھر بانسری کی آواز میں اور تیزی آ گئی تھی۔

"جمشید! یہ آواز کم از کم مجھے پاگل کر دینے کے لیے کافی ہے۔"

"اوہ! تب تو کچھ کرنا ہو گا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور زینے کی طرف دوڑ پڑے۔ باقی لوگوں نے بھی ان کا ساتھ دیا، چھت پر پہنچے اور روپ سنگھ کے کوارٹر کی طرف جھک کر چلّائے:

"روپ سنگھ۔ کیا تم میری آواز سُن سکتے ہو۔"

انھوں نے بار بار آواز دی۔ لیکن بانسری کی تیز آواز میں ان کی آواز دب کر رہ گئی۔ انسپکٹر جمشید نے چھت پر ادھر اُدھر دیکھا۔ کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی۔ جو وہ کوارٹر پر مار سکتے۔ آخر انھوں نے اپنا جوتا اتارا اور کوارٹر کی چھت پر دے مارا۔ جلد ہی انھوں نے روپ سنگھ کو باہر آتے دیکھا:

"وہ مارا۔ روپ سنگھ باہر تو آیا۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"روپ سنگھ صاحب۔ ادھر دیکھیے۔ کیا آپ ہماری آواز سن رہے ہیں؟"

لیکن روپ سنگھ نے اوپر نہ دیکھا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ چھت پر کس نے

کیا چیز ماری ہے — انھوں نے بار بار گلا پھاڑا — لیکن
اس کے کان پر کوئی جوں نہ رینگی — اور وہ واپس اند
جانے کے لیے مڑا:

"ارے باپ رے — یہ تو اندر جا رہا ہے۔" انسپکٹر
جمشید نے گھبرا کر کہا اور دوسرا جوتا پاؤں سے نکال کر ا
کے کندھے پر دے مارا — سر کا نشانہ اس لیے نہ
کہ کہیں بے ہوش نہ ہو جائے — جوتا اس کے کندھے
پر لگا — اس نے فوراً اوپر دیکھا۔

اب اس نے انھیں دیکھ لیا — اس کا منہ مارے
حیرت کے کھل گیا — شاید وہ حیران تھا کہ یہ لوگ
کس طرح پہنچ گئے — یہ تو گاؤں چلے گئے تھے — ا
نے کچھ کہا، لیکن آواز ان تک نہ پہنچ سکی — انھوں
اشاروں میں اس سے کہا کہ وہ صدر دروازے کی طرف
آئے — اس نے یہ اشارہ سمجھ لیا — اور دروازے کی طرف
چل پڑا — انھوں نے بھی نیچے کا رخ کیا اور درواز
پر آ گئے — انھوں نے دھپ دھپ کر کے روپ سنگھ
کو مخاطب کیا — باہر سے بھی دھپ دھپ کی آواز
سنائی دی:

"روپ سنگھ کیا تم میری آواز سن سکتے ہو؟"

باہر سے کوئی جواب نہ ملا۔

"نہیں — وہ صرف دھپ دھپ کر سکتا ہے — آواز نہیں
سن سکتا۔"

"لیکن اس دھپ دھپ کا مطلب یہ تو ہے نا کہ
ہم دروازہ کھلوانا چاہتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے — اس سے دروازہ نہ کھل رہا ہو۔"

"ہاں! یہ بات بھی ہے — اگر یہ حرکت بھوتوں کی ہے
پھر دروازہ اس سے نہیں کھل سکتا۔"

"اُف مالک! یہ ہم کہاں پھنس گئے۔" خان رحمان نے گھبرا
کر کہا۔

"مسلسل آواز اب دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی
ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"آپ کم از کم انگلیاں تو کانوں میں ٹھونس لیں۔"

انھوں نے انگلیاں ٹھونس لیں، لیکن آواز تو انھیں اپنے
ذہن میں سے اٹھتی محسوس ہو رہی تھی:

"جمشید — تم آواز کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔"
پروفیسر داؤد نے کہا۔

"آواز کی تہ — ارے باپ رے۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"کیوں — تمھیں کیا ہوا؟"

"آواز کی تہ بھی ہو سکتی ہے — ویسے یہ کسی ناول کا… ہو سکتا ہے۔"

"آواز کی تہ سے میرا مطلب تھا — آواز کا راز جا… کی کوشش کیوں نہیں کر لیتے — اس کا فائدہ یہ ہو گا… تم آواز کو بند کر سکو گے۔"

"لیکن اس میں وقت لگ جائے گا۔"

"اب ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔" انھوں نے بے چارگ… عالم میں کہا۔

"اچھی بات ہے — آپ یہاں بیٹھ جائیں — ہم کوش… کرتے ہیں۔"

"یار تم مجھے ساتھ رکھو — یا پھر خان رحمان کو میرے… چھوڑ دو۔"

"اگر آپ ساتھ رہنا پسند کریں تو ہمیں کوئی اعتراض…"

اور وہ ان کے ساتھ ہی اندر کی طرف بڑھے —

انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی دیواروں کا جائزہ کان لگ… کر لینا شروع کیا — محمود، فاروق، فرزانہ اور خان… بھی یہی کرنے لگے — اس طرح انھوں نے ایک ایک… تمام کمروں کو چیک کیا — پھر وہ اس کمرے کے پاس… جس میں دروازہ نہیں تھا — جونہی انسپکٹر جمشید نے…

کی دیوار سے کان لگایا — وہ چلّا اُٹھے:

"آواز اس میں سے آ رہی ہے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"اُف مالک!" پروفیسر نے گھبرا کر کہا۔

"کیا ہوا — کیا آپ آواز کی وجہ سے بہت زیادہ بے چین ہیں؟"

"وہ تو میں ہوں، لیکن — اس طرف دیکھو۔"

انھوں نے اس سمت میں دیکھا، جس طرف انھوں نے اشارہ کیا تھا — اور پھر ان کی نظریں وہاں چپک کر رہ گئیں —

ایک دیوار میں سے خُون کی ایک لکیر سی نیچے کی طرف آ رہی تھی — ساتھ ہی انھوں نے پروفیسر داؤد کی چیخ سُنی۔

◉

وہ گھبرا کر ان کی طرف مڑے اور پھر مارے خوف کے ان کی نظریں پھیل گئیں — پروفیسر داؤد کے ناک سے خُون کی ایک باریک لکیر نکل کر ہونٹ پر آ کر رک گئی تھی — انھوں نے غالباً اس لکیر کو محسوس کر لیا تھا

اور اُنگلی لگا کر دیکھا تھا – اب اُنگلی پر لگا ہوا خُون انہیں
دکھا رہے تھے –

"یہ بانسری کی مسلسل آواز کی وجہ سے ہے شاید۔" خان
رحمان نے جلدی سے کہا۔

"میرا خیال بھی یہی ہے۔"

"تت – تو کیا – اس کمرے کی ناک سے بھی خُون بانسری
کی آواز سے بہ نکلا ہے۔" فاروق نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

"ابھی ہم کچھ نہیں کر سکتے – کاش – آج محمود کا چاقو ہمارے
پاس ہوتا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"اس صورت میں ہم کیا کرتے؟"

"اس کمرے کی کچھ اینٹیں نکال کر اندر جھانکتے – اور ضرورت
محسوس ہوتی تو اس کے اندر جاتے۔"

"ہوں – جمشید – اب میرا اس محل سے ...."

ان کے الفاظ درمیان میں رہ گئے – دروازہ کھُلنے کی
بہت زور دار آواز گونجی تھی – ساتھ ہی چوکیدار روپ سنگھ کی
آواز سنائی دی :

"آپ لوگ کہاں ہیں – جلدی آئیے – دروازہ کھُل
گیا ہے۔"

وہ فوراً دروازے کی طرف دوڑ پڑے – دروازہ واقعی

کھُلا تھا اور باہر رُوپ سنگھ پریشان سا کھڑا تھا – جونہی وُہ باہر
نکلے – اس نے کہا :

"گرو کی کرپا سے آپ سب ٹھیک ہیں ، یہ دیکھ کر
خوشی ہوئی۔"

"جی نہیں – اللہ کی مہربانی سے۔" محمود نے منہ بنایا۔

"آپ نے دروازہ کیوں نہیں کھولا تھا؟"

"کھولتا کیسے – پورا زور لگانے کے باوجود نہیں کھُلا –
اور جب کھُلا تو خود بخود کھُلا۔" اس نے بُرا سا منہ بنایا۔

"کیا پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے؟"

"مجھے تو یاد نہیں کہ کبھی ایسا ہوا ہو۔"

"ہم ذرا آپ کے کمرے میں بیٹھ کر کچھ مشورہ کرنا
چاہتے ہیں۔"

"چلیے – میں حاضر – میرا کمرہ حاضر۔" اس نے فوراً کہا۔

وہ اس کے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے – یہاں بانسری کی
آواز نہ ہونے کے برابر تھی – گویا محل میں اب بھی گونج
رہی تھی :

"یہ بانسری کی آواز کیا محل سے ہر روز گونجتی ہے؟"

"جی نہیں – ہر روز تو نہیں – ہاں جس روز کوئی محل میں
داخل ہوتا ہے – اس دن ضرور ایسا ہوتا ہے۔"

"بہت خوف ناک آواز ہے — میرے دماغ پر ہتھوڑے
سے برستے رہے ہیں — اور یہ دیکھیں — خون تک نکل آیا ہے"
پروفیسر داؤد نے ناک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ — ارے باپ رے" وہ گھبرا گئے۔

"اب آپ یہاں آرام کریں — روپ سنگھ صاحب آپ
کا خیال رکھیں گے — ہم ذرا اندر ہو آئیں"

"آپ — آپ پھر اندر جائیں گے" اس کے لہجے میں بلا
کی حیرت تھی۔

"ہاں! کیا کیا جائے — مجبوری ہے" فاروق نے منہ بنایا۔

"مجبوری — کیسی مجبوری — میں اب بھی آپ کو گاؤں
کر جا سکتا ہوں اور وہاں آپ کے آرام کا انتظام بھی
ہو جائے گا"

"ن — نہیں — ہم اس محل میں ہی آرام کریں گے"

"اس قدر تیز آواز میں بھلا آپ آرام کر لیں گے"

"یہ ہمارا مسئلہ ہے — ارے ہاں — آپ ذرا پانی پلائیں گے"
انسپکٹر جمشید نے چونک کر کہا۔

"ضرور — کیوں نہیں"

جونہی وہ پانی لینے گیا — انسپکٹر جمشید فوراً اٹھے اور کمرے
کے آتش دان پر رکھی ایک بڑی سی چیز اٹھا کر اپنی جیب

میں ٹھونس لی — ساتھ ہی انھوں نے باقی لوگوں کو خاموش
رہنے کا اشارہ کیا — یہاں تک کہ روپ سنگھ پانی لے آیا۔
پروفیسر داؤد کو وہیں چھوڑ کر وہ ایک بار پھر محل کے
دروازے کی طرف بڑھے — اب پروفیسر داؤد نے ان
کے ساتھ چلنے کی ضد نہیں کی تھی — وہ آواز ان کے
لیے ناقابلِ برداشت تھی — ناقابلِ برداشت ان کے لیے
بھی تھی، لیکن — وہ مجبور تھے — اپنی عادت سے، اپنی فطرت
سے — اپنے فرض سے —

"آپ لوگ بھی عجیب لوگ ہیں — اب پھر وہاں جا
رہے ہیں — جہاں صرف اور صرف موت ہے"

"موت اور ہمارا چولی دامن کا ساتھ ہے، لہٰذا آپ
فکر نہ کریں"

"اچھی بات ہے — جیسے آپ کی مرضی"

اور پھر وہ محل کے دروازے پر پہنچ گئے — دروازہ
اب تک کھلا تھا — وہ اندر داخل ہو گئے:

"ہم دروازہ اندر سے بند نہیں کریں گے — آپ بھی باہر
سے بند نہ کریں"

"باہر سے میں کیوں بند کروں گا بھلا — نہ پہلے کیا
تھا — یہ تو بھوتوں یا جنوں کا کام ہے — ارے باپ رے"

اس نے کانپ کر کہا۔

"اگر ہماری ان سے ملاقات ہوئی۔ تو آپ کا ذکر ان سے کر دیں گے کہ آپ کا خیال رکھا کریں۔" فاروق نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"نن۔ نہیں۔ نہیں۔ ایسا نہ کریں۔"

ان کے محل میں داخل ہوتے ہی انھیں یُوں لگا جیسے بانسری کی آواز ایک بار پھر بہت تیز ہو گئی ہو۔ چند منٹ تک وُہ حد درجے بلند ہوئی، پھر یک لخت رک گئی۔

یک دم موت کا سناٹا محل میں طاری ہو گیا۔

"لیجیے۔ بانسری کی آواز سے تو نجات ملی۔ کیوں نہ اب ہم پروفیسر انکل کو بلا لیں۔"

"میرا خیال ہے۔ انھیں تو رہنے ہی دیتے ہیں۔ بانسری کی آواز پھر شروع ہو سکتی ہے۔"

"ہوں! ٹھیک ہے۔ آگے بڑھو۔"

وہ چلتے ہوئے محل کے صحن میں آ گئے۔ پھر اس کمرے کی طرف بڑھے۔ جس میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ خون کی لکیر جُوں کی تُوں تھی۔ لیکن ابھی بہ کر نیچے تک نہیں آ سکی تھی۔ ہاں لمبی ضرور ہو گئی تھی۔

"اب ہمیں اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔"

"لیکن کون سا کام؟"

"اس کمرے کو اندر سے دیکھنے کا کام۔"

"اوہ۔ ہاں۔ واقعی۔" خان رحمان بولے۔

انسپکٹر جمشید نے جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ چیز باہر نکالی۔ انھوں نے دیکھا۔ وہ ایک چھوٹی سی ہتھوڑی تھی:

"اس سے ہم کچھ کام تو لے ہی سکتے ہیں۔"

یہ کہ کر انھوں نے کمرے کی دیوار پر اس جگہ ہتھوڑی ماری، جہاں سے خون نکل رہا تھا۔ ان کا ایسا کرنا تھا کہ محل ہزاروں چیخوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ یہ آوازیں مسلسل آنے لگیں۔ انھیں یوں لگا، جیسے ہزار ہا آدمی مسلسل چیخ رہے ہوں۔

"یہ اتنے بہت سے آدمی کہاں سے آ گئے ان لوگوں کے پاس۔" فاروق نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

انسپکٹر جمشید نے ہاتھ روک لیا۔ جلد ہی چیخیں رک گئیں۔ انھوں نے ایک بار پھر ہتھوڑی ماری، چیخیں پھر بلند ہوئیں:

"حیرت ہے۔ ہتھوڑی مارتے ہی چیخیں بلند ہوتی ہیں۔" وہ بڑبڑائے۔

"ہاں! ہوتی ہیں۔ بلند چیخیں۔ ہوتی رہیں گی بلند چیخیں۔ اس لیے کہ۔ میں یہاں دفن ہوں۔ کوئی میرے آرام میں

خلل ڈالے گا تو میں ضرور چیخوں گی — یہ چیخیں ہزاروں لوگوں کی نہیں، صرف میری ہیں — کیا سمجھے!"

"تت — تو آپ سیٹھ امر سنگھ کی بیوی کی رُوح ہیں؟" فارُوق نے لرز کر کہا۔

"ہاں! میں اس کی روح ہوں — اور اس محل میں کسی کو نہیں رہنے دوں گی — امر سنگھ نے یہ صرف میرے لیے بنوایا تھا — نہ کہ دوسروں کے لیے۔" روح نے کہا۔

"اچھی بات ہے — ہم واپس چلے جاتے ہیں — لیکن — اس کمرے کو اندر سے دیکھنا چاہتے ہیں؟"

"اندر میری قبر ہے اور بس — تم دیکھ کر کیا کرو گے — جاؤ — اپنا کام کرو — ورنہ پھر میں بہت بُری طرح پیش آؤں گی۔"

انھوں نے ایک دُوسرے کی طرف دیکھا، پھر انسپکٹر جمشید نے دیوار پر زور زور سے ہتھوڑی برسانا شروع کر دی، ہتھوڑی چھوٹی تھی — اور کمرے کی دیوار بہت مضبوط — بڑا ہتھوڑا ہوتا تو ان کا کام آسان تھا —

"تو تم باز نہیں آؤ گے؟"

"نہیں! ہم تم سے دو دو ہاتھ کر کے ہی جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے — اب تمھارے اور میرے درمیان باقاعدہ جنگ ہو گی — اب تم اپنی زندگی کی بھیک مانگو گے، لیکن

میں تمھیں یہ بھیک نہیں دوں گی — تمھارا دوست — بوڑھا دوست چوکیدار کے کمرے سے ایسا غائب ہو گا کہ اس کا نام و نشان تک کسی کو نہیں ملے گا۔"

"نن — نہیں۔" وہ ایک ساتھ چلّائے۔

"اور تم بھی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکو گے، اس لیے کہ تم یہاں میرے قبضے میں ہو گے۔"

"دیکھو پیاری روح — اچھی روح — ہمارے انکل کو کچھ نہ کہنا — اپنی دشمنی صرف اور صرف ہم سے نکالو۔"

"جاؤ — پہلے جا کر اپنے دوست کی خبر لو۔" روح نے چیخ کر کہا۔

وہ پریشان ہو گئے — باہر کی طرف بھاگے — محل کا بیرونی دروازہ کھلا تھا — وہ چھلانگیں لگاتے باہر نکل آئے اور رُوپ سنگھ کے کمرے کی طرف دوڑے — جونہی اندر داخل ہوئے — دھک سے رہ گئے —

جنت کے مہمان

کمرے کے فرش پر روپ سنگھ بالکل ساکت پڑا تھا اور
پروفیسر داؤد کا کہیں نام و نشان نہیں تھا — انسپکٹر جمشید نے
روپ سنگھ کی آنکھوں کے پپوٹے اٹھا کر دیکھے — پتلیاں
بالکل ساکن تھیں — گویا وہ مکمل طور پر بے ہوش تھا —
انھوں نے کمرے کا بغور جائزہ لیا — کمرے کے باہر
کا جائزہ لیا —

"یہاں پروفیسر صاحب اور روپ سنگھ کے پیروں کے
علاوہ اور کسی کے پیروں کے نشانات نہیں ہیں اور یہ بات
حد درجے عجیب و غریب ہے — آخر یہ کیسے ممکن ہے؟"

"یہ اس طرح ممکن ہے ابا جان کہ پروفیسر انکل کو کسی
انسان نے نہیں، ایک روح نے غائب کیا ہے" فرزانہ
نے کہا —

"ہوں! پروفیسر صاحب کو چاہے کسی نے بھی غائب کیا

ہو — ہم ان کو ساتھ لیے بغیر یہاں سے نہیں جائیں
گے، یا ہم اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے یا
پھر انھیں تلاش کر کے ساتھ لے جائیں گے" انسپکٹر جمشید
نے کہا —

"تب پھر ہم اپنی تلاش شروع کرتے ہیں" —

انھوں نے اس کمرے کے ایک ایک چپے کو بغور
دیکھا، لیکن کسی تہ خانے وغیرہ کے آثار نظر نہ آئے —
اب انھوں نے روپ سنگھ کو ہوش میں لانے کی کوشش
شروع کی، پانچ منٹ بعد اس نے آنکھیں کھول دیں:

"مم — میں کہاں ہوں؟" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"آپ اپنے کمرے میں ہی ہیں — پروفیسر صاحب کہاں ہیں،
وہ ہمارے ساتھی"

"مجھے کچھ نہیں معلوم — مجھے تو اچانک ایک چکر آیا تھا اور
پھر میں بے ہوش ہو گیا"

"اس کا مطلب ہے — آپ کو کچھ بھی معلوم نہیں"

"نہیں بالکل نہیں"

"اچھا یہ بتائیں — اس کمرے کے نیچے کوئی تہ خانہ تو موجود
نہیں ہے؟"

"تہ خانہ — کیا بات کرتے ہیں جی" اس کے لہجے

میں حیرت تھی۔

"اچھا شکریہ — ویسے ہم چاہتے ہیں — آپ بھی ہمارے ساتھ محل میں چلیں۔"

"مم — مم — میں — میں — ہرگز نہیں — اور کیا آپ میں اب بھی اندر جانے کی ہمت ہے؟"

"بات ہمت کی نہیں — اپنے ساتھی کو تلاش کرنے کی ہے۔"

"ہوں! خیر — آپ کی مرضی — میں کیا کر سکتا ہوں۔ لیکن ان حالات میں میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"اچھا! آپ آرام کریں۔"

وہ اس کے کمرے سے نکل کر دروازے کی طرف آئے — ایسے میں انسپکٹر جمشید نے محمود کے کان میں سرگوشی کی — اس نے بات کو سمجھ جانے کے انداز میں سر ہلایا۔

آخر وہ محل میں داخل ہوئے — دروازہ انھوں نے کھلا چھوڑ دیا — انسپکٹر جمشید اس مرتبہ روپ سنگھ کے کمرے سے ایک پھاوڑا اٹھا لائے تھے اور یہ پھاوڑا انھوں نے اس وقت اٹھا کر باہر رکھ دیا تھا، جب وہ ابھی بے ہوش تھا، لہٰذا اسے پتا نہ چل سکا۔

انھوں نے پھاوڑا پوری قوت سے اس جگہ دے مارا

جہاں سے خون رس رہا تھا — اچانک خون کی دھار ان کے چہرے پر پڑی — وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹ گئے۔

"ارے باپ رے — دیوار میں اتنا خون کہاں سے آ گیا؟"

ادھر پھاوڑا چلنے کے ساتھ ہی چیخیں بلند ہوئیں اور اس قدر بلند شور ہوا کہ ان کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے، دل زور زور سے دھڑکنے لگے — ادھر انسپکٹر جمشید پر جیسے جنون سوار ہو گیا — لگے اوپر تلے پھاوڑا برسانے۔

"تم لوگ اب پوری طرح میرے شکنجے میں آ چکے ہو — پہلے تم نے اپنا ایک ساتھی گنوایا — اب دوسرے ساتھی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہو۔" روح کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔

"کیا مطلب؟" وہ چلّائے۔

"تم جسے باہر چھوڑ آئے تھے — اب وہ تمھیں باہر نہیں ملے گا — یقین نہیں تو جا کر دیکھ لو۔"

ان پر بوکھلاہٹ سوار ہو گئی — دوڑے باہر کی طرف اور پھر انھوں نے محمود کو اِدھر اُدھر دیکھا — اُلّو کی آواز نکال کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش بھی کی، لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا — اس مرتبہ انسپکٹر

جمشید نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ محمود کو باہر چھوڑ تے۔
اور اس کے کان میں کہ دیا تھا کہ وہ محل کے باہر رہ
کر نگرانی کرے۔ لیکن اب پروفیسر داؤد کے بعد محمود بھی
غائب ہو چکا تھا۔

"گگ۔ کہیں۔ ایک ایک کر کے ہم سب غائب نہ ہو
جائیں۔" فاروق نے لرزتے ہوئے کہا۔

"دیکھا جائے گا۔ اب تم باہر رہو گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جج۔ جی۔ کیا فرمایا۔ اب میں باہر رہوں گا۔ گویا اب
میرے غائب ہونے کی باری ہے۔ آپ ایک ایک کر کے سب
کو غائب کروا کر خوش ہوں گے کیا؟"

"نن۔ نہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں۔ یہ چکر کیا ہے۔
اور یہ جاننے کے لیے اگر ہم سب کو باری باری غائب بھی
ہونا پڑا تو ہم ہوں گے۔ تم فکر نہ کرو فاروق۔ تمھارے بعد
میں خود باہر ٹھہروں گا۔"

"جی۔ کیا فرمایا۔ اس کا مطلب ہے۔ اگلی مرتبہ میں اور انکل
خان رحمان اکیلے اندر جائیں گے۔"

"ہاں! اور تم پھاوڑے برساؤ گے۔ دراصل روح کی کوشش
یہ ہے کہ ہم اس کمرے کی دیوار میں سوراخ نہ کر سکیں۔
اور سوراخ ہم کر کے رہیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ ابا جان۔"

اور وہ فاروق کو باہر چھوڑ کر اندر چلے گئے۔ انسپکٹر
جمشید نے ایک بار پھر پھاوڑے چلانے شروع کر دیے۔
اس جگہ سے خون نکلنا اب بند ہو گیا تھا اور محل کے
فرش پر خون پھیلا ہوا تھا۔ انھیں اس خون سے بھی اپنے
پیر بچانا پڑ رہے تھے۔

اچانک محل میں گھپ اندھیرا ہو گیا۔

"جب کچھ نہ بنا تو لائٹ آف کر دی۔ روح بے چاری
پریشان ہو گئی ہے۔" انسپکٹر جمشید ہنسے اور جیب سے پنسل ٹارچ
نکال لی۔

"جی کیا مطلب۔ کیا یہ لائٹ روح نے آف کی ہے؟"

"جو کوئی بھی ہے۔ اسی نے آف کی ہے۔ ہم تو کرنے
سے رہے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی ٹارچ روشن ہو گئی اور
انسپکٹر جمشید اس کی روشنی میں پھاوڑا برسانے لگے۔ وہ
پوری قوت صرف کر رہے تھے، لیکن دیوار بھی شاید
کنکریٹ کی تیار کی گئی تھی۔ بہت سخت تھی۔ آہستہ آہستہ
ٹوٹ رہی تھی۔ ادھر انھیں ڈر تھا کہ ٹارچ کے سیل نہ
ختم ہو جائیں۔

"عجیب بات نوٹ کی ابّا جان۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"کیا!" وہ بولے، لیکن ان کے ہاتھ برابر حرکت میں تھے

"اب پھاوڑا لگنے سے چیخیں بلند نہیں ہوتیں۔"

"اس لیے کہ اب خون بہ چکا ہے — دیوار بے جان ہو چکی ہے — چیخیں کیسے نکلیں گی۔" انھوں نے ہنس کر کہا۔

اچانک انھوں نے ایک حد درجے خوف ناک آواز سنی — انھیں یوں لگا جیسے ان کے بالکل نزدیک کوئی خوف ناک وجود زور زور سے سانس لے رہا ہو —

"یہ — یہ کون سانس لے رہا ہے؟"

"روح — اپنی آخری سانسیں گن رہی ہے۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"اپنے دوسرے لڑکے کی بھی خبر لے لو جا کر — وہ بھی غائب ہو گیا ہے؟"

"نہیں جائیں گے — ایک بار ہی جائیں گے اب —" انسپکٹر جمشید نے جھلا کر کہا۔

"اب تم لوگوں کی باری ہے۔" سرسراتی آواز سنائی دی۔

"اچھا ہی ہے — ہماری باری بھی آ جائے — اپنے ساتھیوں کے پاس تو پہنچ جائیں گے۔"

"ہاں! اب ایسا کرنا ہی پڑے گا — ورنہ تم اس دیوار

کو ضرور توڑ دو گے — اور پھر..." روح کہتے کہتے رک گئی۔

"اور پھر کیا؟"

"اور پھر یہ کہ — تم — نہیں — کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، تم دیکھ ہی لو گے۔"

"اچھا تو پھر دکھاؤ — کیا دکھانا چاہتے ہو؟"

اچانک ان کے آس پاس تیز بو پھیل گئی — انھیں زور کا چکر آیا —

"ہم — ہم بے ہوش ہو رہے ہیں ابّا جان۔" فرزانہ نے گھبرا کر کہا۔

"گگ — کوئی بات نہیں — مجھ پر بھی یہ گیس اثر انداز ہو رہی ہے۔"

"اللہ مالک ہے۔"

اور پھر انھیں کوئی ہوش نہ رہا — ہوش آیا تو وہ ایک گنبد نما کمرے میں تھے — اس کی چھت بالکل گنبد جیسی تھی — انھوں نے دیکھا، وہاں پروفیسر داؤد، محمود اور فاروق بھی تھے —

"آپ لوگ کس طرح غائب ہوئے تھے — یہ تو ہمیں بتا دیں۔"

"بس ایک تیز بو کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے تھے۔"

انھوں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے — سب کو ایک ہی طریقے سے بے ہوش
کیا گیا، لیکن ہم ہیں کہاں؟"

"پتا نہیں — کم از کم محل میں تو ہم نے کوئی ایسا
کمرہ دیکھا نہیں۔"

"اور ہمارے علاوہ یہاں کوئی اور ہے بھی نہیں۔
ہم اس کمرے کا راز بھی نہ جان سکے — دیوار میں سوراخ
بھی نہ کر سکے۔"

"اس روح نے اتنا موقع ہی کب دیا ہے — خیر کوئی
بات نہیں — اب روح سے براہِ راست ملاقات جو ہو
جائے گی، وہ بتا دے گی سب کچھ۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا — اور سفید لباس میں چند
لڑکیاں اندر داخل ہوئیں:

"جنت کے نئے مہمانو — ہم تمھیں خوش آمدید کہتی ہیں۔"

"جنت کے مہمان — کیا مطلب — یہ کیا کہ رہی ہیں
آپ؟" انھوں نے کہا۔

"ہم حوریں ہیں — یہ جنت کا ایک گنبد ہے — جو
آپ کو دیا گیا ہے — آپ لوگوں نے دُنیا میں بہت اچھے
اچھے کام کیے — اللہ تعالیٰ آپ سے بہت خوش ہیں —

اور انعام کے طور پر یہ گنبد انھوں نے آپ کو عطا کیا ہے،
اصل انعام تو قیامت کے دن ملے گا۔"

"گویا ہم مر چکے ہیں۔"

"ہاں! آپ لوگوں کی دنیاوی زندگی ختم ہو گئی۔"

"لیکن اس محل میں کیا تھا — وہ روح کس کی تھی؟" محمود
نے پوچھا۔

"یہاں آکر دُنیا کی باتیں نہیں کی جاتیں — یُوں بھی ہم
حُوریں ہیں — ہمیں دُنیا کی کیا خبر — آپ کا کوئی ساتھی
بعد میں یہاں آئے گا تو اس سے پوچھ لیجیے گا۔"

"نہیں۔ بہت بھوک لگی ہے — کیا اس جنت میں کھانے
کو نہیں ملتا؟"

"ضرور ملے گا — یہاں تو جس چیز کی ضرورت محسوس کرو
گے — وہی حاضر کی جائے گی۔"

"تب پھر میں تو مچھلی کھاؤں گا — بہت دن ہو گئے
مچھلی نہیں کھائی۔"

"آج تو مچھلی نہیں مل سکے گی۔"

"ابھی تو آپ کہ رہی تھیں..." پروفیسر داؤد نے بُرا
سا منہ بنایا۔

"ہاں! لیکن روز کے حساب سے ملے گا — آج کے دن

پرندوں کا گوشت آپ کو ملے گا۔ کھانا لے آؤ، ان نئے مہمانوں کے لیے۔"

اسی وقت چند اور حوریں اندر آئیں۔ ان کے ہاتھوں میں کھانوں کے بڑے بڑے تھال تھے۔ ان تھالوں میں واقعی پرندوں کا بھنا ہوا گوشت تھا۔ تھال رکھ کر حوریں باہر نکل گئیں۔ دروازہ خود بخود بند ہو گیا اور وہ کھانے لگے۔ بہت بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ ڈٹ کر کھایا۔ اور جونہی کھانے سے فارغ ہوئے۔ انھیں زبردست نیند نے آ گھیرا۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ جاگتے رہیں، لیکن نیند نے انھیں بے بس کر دیا اور وہ پھر سے سو گئے۔ اس بار ان کی آنکھ کھلی تو وہ ایک سبزہ زار میں تھے:

"ارے! وہ گنبد کہاں گیا؟" فرزانہ چونکی۔

"گنبد۔ پپ۔ پتا نہیں۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"شاید یہ اس گنبد کے باہر باغ ہے۔ یہ بھی ہمارا ہے، ہم اس میں گھوم پھر سکتے ہیں۔ درختوں کے پھل وغیرہ کھا سکتے ہیں۔"

"تو کیا۔ ہم سچ مچ مر گئے ہیں؟" محمود نے کہا۔

"ہاں! تو کیا لوگ جھوٹ موٹ بھی مرتے ہیں؟" فاروق نے کہا۔

"دوستو۔ عیش کرو عیش۔ کھاؤ پیو اور یہ بھول جاؤ کہ تم دنیا میں کون تھے۔ کیا کرتے تھے۔" ایک آواز سنائی دی۔ آواز بالکل اسی روح کی تھی۔

"ارے! یہ تو بالکل اسی روح کی آواز ہے۔"

"چلو شکر کرو۔ کسی اور روح کی آواز نہیں ہے۔"

اچانک انھوں نے ایک زور دار قہقہہ سنا۔

عجیب منظر

انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا، لیکن ہنسنے والا کہیں بھی نظر نہ آیا۔

"کک — کون ہو بھائی — کیوں ہنس رہے ہو — کس نے مارا ہے تمھیں" فاروق نے بھنّائے ہوئے انداز میں کہا۔

"تم بھی عجیب ہو — کسی کے مارنے سے دوسرا ہنستا نہیں، روتا ہے۔" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"اوہ ہاں! یہ تو میں بھول ہی گیا — خیر — سوال یہ ہے کہ قہقہہ کون لگا رہا ہے؟"

"جن — اس عمارت کا جن۔" آواز آئی۔

"لیجیے — اب تک تو صرف رُوح سے باتیں کرتے رہے ہیں — اب جن صاحب بھی میدان میں آ گئے — آگے تو شاید چڑیل اور بھوت بھی آئیں گے۔"

"آنے کا کیا ہے — کوئی چیز بھی آ سکتی ہے۔"

"اگر تم لوگ اس محل کے پاس سے فوراً نکل جانے

کا وعدہ کرو تو ہم تمھیں چھوڑ سکتے ہیں — اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم نیک دل رُوحیں، شریف جن اور بھلے مانس بھوت ہیں۔" آواز سُنائی دی۔

"آپ — آپ نے چڑیلوں کی تعریف میں کچھ نہیں کہا۔" فاروق ڈرے ڈرے انداز میں بولا۔

"ایماندار چڑیلیں۔" آواز فوراً سنائی دی۔

"بھئی — خطابات ہوں تو ایسے — ابا جان — ان کی پیش کش کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"اچھی ہے — اگر یہ ہمیں یہاں سے نکل جانے دیں تو ہم ..." انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔

"تو ہم کیا؟" آواز نے فوراً کہا۔

"تو ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"بہت خوب! آنکھیں بند کر لیں۔"

انھوں نے آنکھیں بند کر لیں — پھر ان سب کو چکر سا آ گیا اور وہ تڑا تڑ گرتے چلے گئے — ہوش میں آئے تو محل کے باہر پڑے تھے:

"شاید — شاید ہم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔"

"نہیں — یہ خواب نہیں، حقیقت تھی — یہ لوگ ہمارے ساتھ بلی چوہے کا کھیل کھیل رہے ہیں۔"

"اور ہم ان کے ہاتھوں میں کیوں کھیلیں۔ ہم صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے، لیکن رات تو یہاں گزارنا ہو گی آخر۔"

"وہ ہم محل سے دُور کہیں گزار لیں گے۔"

"آؤ چلیں۔"

اور وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ کافی دیر تک چلتے رہے، پھر چکر کاٹ کر واپس پلٹے:

"ہم نے ان سے کہا تھا کہ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ یہ نہیں کہا تھا کہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرا کر بولے۔

"بہت خوب! لیکن اب جونہی ہم محل میں داخل ہوں گے۔ پھر انھیں پتا چل جائے گا اور وہ پھر ہمیں اس گیس سے بے ہوش کر دیں گے۔"

"ہم کوشش کریں گے کہ ایسا نہ ہو سکے۔" انسپکٹر جمشید مسکرا دیے۔

"جیسے آپ کی مرضی۔"

وُہ محل کے نزدیک پہنچ گئے، لیکن دروازہ بند نظر آیا۔ نزدیک پہنچے تو اس کے دروازے پر تالا بھی لگا ہوا تھا:

"یہ۔ یہ کیا۔ اس کے دروازے پر تالا؟"

"شاید روپ سنگھ نے اس خیال سے لگا دیا ہے کہ کوئی اندر نہ گھس جائے اور مصیبت میں مبتلا نہ ہو جائے۔" وہ بولے۔

"لیکن اگر ہم اسے جگائیں گے۔ تو بات چھپی نہیں رہ جائے گی۔"

"لیکن اس صورت میں صرف روپ سنگھ کو پتا چلے گا اور اسے ہم اپنے ساتھ رکھیں گے۔ یا پھر..." انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔

"یا پھر کیا؟"

"یا پھر یہ کہ اُسے تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش کر جائیں گے۔"

"اس طرح بھی آواز پیدا ہو گی۔ کیوں نہ ہم اس کے کمرے سے محل کے دروازے کی چابی حاصل کر لیں۔ چابی تلاش کر لینا ہمارے لیے مشکل کام نہیں ہو گا۔"

"ہوں! یہ ٹھیک رہے گا۔"

"تو پھر محمود۔ صرف تم اس کے کمرے میں جاؤ۔ اور چابی لے آؤ۔"

"م م۔ میں اکیلا؟"

"اچھا تم فاروق کو ساتھ لے لو۔"

"میرے بغیر تو اس کی روٹی ہضم نہیں ہوتی۔" فاروق نے جھلا کر کہا۔

"اگر تم نہیں جانا چاہتے تو میں چلی جاتی ہوں اس کے ساتھ۔" فرزانہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"بس بس — رہنے دو۔"

اور پھر دونوں آگے بڑھ گئے — روپ سنگھ کے کمرے کا دروازہ بھی بند تھا — یہ دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رک گئے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھا:

"اب کیا کریں؟" محمود نے اشارے میں کہا۔

"اب دستک دے کر اسے جگانا ہوگا۔"

"لیکن اس طرح آواز پیدا ہوگی اور ہم یہ کام آواز پیدا کیے بغیر کرنا چاہتے ہیں۔"

"ہوں — خیر۔" فاروق نے جیب سے ایک مڑا تڑا تار نکالا اور اسے تالے کے سوراخ میں داخل کر دیا — وہ کئی منٹ تک تالا کھولنے کی کوشش کرتا رہا، پھر محمود کو اشارہ کیا — محمود نے بھی اپنی سی کوشش کر دیکھی، لیکن تالا نہ کھلا۔

اب وہ کھڑکی کی طرف آئے — کھڑکی میں سلاخیں

لگی تھیں، لیکن دروازے کے پٹ نہیں لگائے گئے تھے — کھڑکی میں سے انھوں نے روپ سنگھ کو سوتے دیکھا — پھر فاروق نے ایک کنکر اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری — وہ ذرا سا ہلا اور پھر ساکن ہو گیا — اب محمود نے قدرے بڑی کنکر اٹھائی اور اسے دے ماری — اس بار وہ بڑبڑا کر اٹھا — اس نے اِدھر اُدھر دیکھا — اور پھر اس کی نظریں کھڑکی پر جم گئیں — وہ اٹھ کر ان کے نزدیک آ گیا — اس سے پہلے کہ وہ کچھ بول سکتا، محمود نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دروازہ کھولنے کے لیے بھی اشارہ کیا —

اس نے دروازہ کھول دیا — وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باقی لوگوں تک کھینچ لائے — اب محمود نے سرگوشی میں کہا:

"ابھی تک ہم نے کوئی آواز نہیں پیدا کی۔"

"بہت خوب!" انھوں نے یہ بھی اشارے میں کہا اور اسے دور کھینچ لے گئے۔

"بب — بات کیا ہے سرکار؟"

"اب تک ہم محل میں اعلانیہ جاتے رہے ہیں — اب بالکل خاموشی کے عالم میں جانا چاہتے ہیں — آپ

دروازے کی چابی دے دیں۔"

"اوہ چابی"۔ وہ چونکا۔

"ہاں چابی"۔

"چابی لینے کے لیے تو مجھے اپنے کمرے میں جانا پڑے گا"۔ وہ بولا۔

"محمود — تم ان کے ساتھ جاؤ"۔

"ان کی ضرورت نہیں — میں چابی لے آتا ہوں"۔

"نہیں — یہ ساتھ جائیں گے"۔ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا مطلب؟"

"ہم دیکھنا چاہتے ہیں — آخر روحوں کو کس طرح پتا چل جاتا ہے"۔

"روحیں — آخر روحیں ہیں"۔ اس نے کہا۔

"نہیں — انھیں ضرور پہلے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی محل میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتا ہے"۔

"بھلا انھیں کون بتاتا ہو گا؟"

"یہی دیکھنا ہے"۔

"ٹھیک ہے — آئیے صاحب"۔ اس نے کہا۔

وہ محمود کو ساتھ لے کر اپنے کوارٹر کی طرف بڑھا — اندر داخل ہونے کے بعد اس نے ایک الماری کو کھولا،

اس الماری کے ایک خانے میں چابی موجود تھی — اس نے چابی اٹھائی اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، لیکن محمود نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا — اور پھر اشارے میں کہا:

"نہیں! آپ کچھ نہیں بولیں گے"۔

دونوں خاموشی سے باہر نکلے اور باقی لوگوں کے پاس پہنچے — دبے پاؤں چلتے وہ محل تک آئے اور تالا کھول ڈالا — اب روپ سنگھ نے انسپکٹر جمشید کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اشارے میں بات کرنے کی کوشش کی:

"میں اب جاؤں؟"

"نہیں! آپ بھی ہمارے ساتھ رہیں گے"۔

"نہیں نہیں — میں اندر آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا — آخر میں کیوں جاؤں"۔

انسپکٹر جمشید نے اچانک اس کا ہاتھ کلائی سے پکڑ لیا — وہ حیرت زدہ رہ گیا — اب انھوں نے اس کے کان میں کہا:

"آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہو گا — وہ بھی اس طرح کہ منہ سے کوئی لفظ نہ نکلے، اگر آپ نے منہ سے کوئی لفظ نکالا تو روحیں بعد میں آپ کو پریشان کریں گی۔

ان سے پہلے میں آپ کے لیے رُوح بن جاؤں گا۔"

وہ کانپ گیا۔ کچھ کلائی انھوں نے اس قدر سختی سے تھامی تھی کہ اس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اور اس حالت میں وہ محل میں داخل ہوئے۔ بند کمرے کے سامنے پہنچ کر وہ رک گئے۔ پھاوڑا یہاں جُوں کا تُوں پڑا تھا، کمرے میں ہونے والا سوراخ بھی اسی طرح موجود تھا۔

انھوں نے پھاوڑا اٹھایا اور اس کے ذریعے آہستہ آہستہ سوراخ کو بڑا کرنا شروع کر دیا۔ اس بار وہ پھاوڑا چلا نہیں رہے تھے۔ بلکہ اس کو اڑا کر سوراخ چوڑا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ روپ سنگھ کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا تو دوسرا جا رہا تھا۔ ایسے میں اچانک اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، عین اسی لمحے محمود نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"خاموش!" اس نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھی۔

وہ ساکت رہ گیا۔ سوراخ بڑا ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ایک آدمی کے اندر جانے کا راستا بن گیا۔

"فاروق تم اندر داخل ہو جاؤ۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر اسے اشارہ کیا۔

"م۔ میں۔ یعنی کہ میں۔"

"اچھا۔ محمود تم جاؤ۔" یہ کہ کر انھوں نے روپ سنگھ کو خود پکڑ لیا۔

محمود سوراخ میں داخل ہو گیا۔ پھر اندر سے اس نے انھیں بھی آنے کا اشارہ کیا۔ گویا اندر کوئی خطرہ نہیں تھا۔

وہ باری باری اندر داخل ہونے لگے۔ ایک بار پھر روپ سنگھ نے باہر ہی رہ جانے کے لیے زور لگایا، لیکن انسپکٹر جمشید نے اسے بازو سے پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا۔ اس حالت میں بھی ایک ہاتھ اس کے منہ پر رہا۔ اندر داخل ہوتے ہی انھیں عجیب سا احساس ہوا۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک قبر بنی ہوئی تھی۔ کمرے کا فرش پختہ تھا۔ قبر بھی پختہ تھی۔ اس کمرے میں سائنسی آلات کی بھرمار تھی۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، جیسے کہ رہے ہوں۔ یہ ہمیں عجیب سا احساس کیوں ہو رہا ہے۔ انسپکٹر جمشید نے اب اس کمرے کا جائزہ شروع کیا۔ اس کے ایک ایک انچ کا جائزہ لیا۔ آخر ایک دیوار میں انھیں جگہ دبتی محسوس ہوئی۔ انگلی سے دباؤ ڈالا تو دو مربع انچ کا سوراخ بن گیا۔ اندر ایک سیاہ رنگ کا بٹن نظر آیا۔ جونہی اسے دبایا گیا۔ قبر درمیان سے کھل گئی۔ اور انھیں سیڑھیاں نظر آئیں۔

انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ روپ سنگھ کو بازو سے
پکڑے ان سیڑھیوں پر اترتے چلے گئے۔ انھیں ایک سرنگ
میں چلنا پڑا۔ سرنگ ختم ہونے پر دیوار سامنے آگئی۔
وہاں بھی ایک دو مربع انچ سوراخ تھا۔ اور اس میں
ویسا ہی بٹن لگا تھا۔ جونہی انھوں نے بٹن دبایا۔ انھیں ایک
عجیب منظر نظر آیا۔

سُرنگ

ایک طرف تو دروازہ نمودار ہوا تھا۔ دُوسری طرف
ایک اور سُرنگ نظر آئی تھی۔ دروازے کے دوسری طرف
روپ سنگھ کا کمرہ تھا۔ اور دوسری سرنگ بہت لمبی
نظر آرہی تھی۔ مطلب یہ کہ اس کا دوسرا سرا انھیں
نظر نہیں آرہا تھا۔

"اب بتاؤ۔ یہ کیا چکر ہے۔ یہاں تو تمھارے علاوہ
کوئی بھی نہیں ہے۔ صاف ظاہر ہے۔ تم اپنے کمرے
سے نکل کر سیدھے اس سرنگ کے ذریعے محل کے بند
کمرے میں آجاتے تھے اور وہاں سائنسی آلات کے ذریعے
اپنا بانسری کا اور چیخوں کا پروگرام شروع کر دیتے تھے۔
تاکہ لوگ خوف زدہ ہو کر بھاگ جائیں۔ یہاں تک تو
بات سمجھ میں آگئی۔ لیکن آخر ایسا کرنے کی ضرورت کیا
ہے۔ یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"بس جناب — لوگ خوف زدہ ہو کر بھاگ جاتے تھے
اور اپنی بہت سی قیمتی چیزیں چھوڑ جاتے تھے — وہ میں اٹھا
لیتا تھا — اور کیا پروگرام ہو گا بھلا۔"

"روپ سنگھ — تم اب تک صرف جھوٹ بولتے رہے
ہو — اور اب بھی جھوٹ ہی بول رہے ہو — لہٰذا میں تمھیں
آخری بار نرمی سے کہ رہا ہوں — اصل بات بتا دو — ورنہ
یہ دوسری سرنگ میرے سامنے ہے — ہم اس میں چلیں گے
اور دوسری طرف گیا ہے — دیکھ ہی لیں گے۔"

"میں کہ چکا ہوں — یہ لوگوں کو لوٹنے کا چکر ہے —
اور بس۔"

"لیکن اس چکر کے لیے اس قدر انتظامات کرنے کی
ضرورت نہیں ہوتی — اس محل کو بھوت محل مشہور کیا گیا
ہے — اس قدر کہ اس طرف سے گزرنا بھی کوئی پسند
نہیں کرتا، جب کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہے — آخر اس کی
ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟"

"میں — میں کچھ نہیں جانتا۔" اس نے کہا۔

"تو پھر کون ہمیں بتائے گا — اس بند کمرے میں بیٹھ
کر چیخوں اور بانسری کا پروگرام تمہارے علاوہ کون نشر
کرتا تھا، جب کہ سرنگ کا سرا تمہارے کمرے تک

آتا ہے۔"

روپ سنگھ ادھر اُدھر دیکھنے لگا، لیکن بولا کچھ نہیں۔

"دیکھو روپ سنگھ — ہم عام آدمی نہیں ہیں — ہمارا تعلق
محکمہ سُراغ رسانی سے ہے۔"

"کیا!!!" وہ چلا اٹھا — آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

"کیوں ہو گئی نا سٹی گم۔" فاروق مسکرایا۔

عین اس لمحے اس نے منہ میں کوئی چیز رکھ لی —

"خبردار!" انسپکٹر جمشید چلائے، لیکن دیر ہو چکی تھی —
وہ موت کا کیپسول چبا چکا تھا — وہ دھم سے گرا اور
ساکت ہو گیا —

"افسوس! ہمیں اس کی تلاشی لے لینی چاہیے تھی۔" فاروق
نے کہا —

"محل کا دروازہ اندر سے بند کر کے ہم اس دوسری سرنگ
میں چلتے ہیں — معاملہ حل ہو جائے گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

انھوں نے ویسا ہی کیا — اور سرنگ میں چلنے لگے —
سرنگ میں روشنی اور ہوا کا انتظام تھا اور انھیں رہ رہ کر
حیرت ہو رہی تھی — سرنگ پختہ تھی — صاف ستھری تھی —
اور ہرگز مدت سے بند محسوس نہیں ہو رہی تھی — گویا وہ استعمال
میں رہتی تھی —

وُہ چلتے رہے — چلتے رہے — اچانک انھیں سرنگ کے
دوسری طرف سے کوئی آتا نظر آیا — وہ دیوار سے لگ گئے،
ان کی آنکھوں میں حیرت اور بڑھ گئی — آنے والے
شاید دو تھے اور باتیں کرتے آ رہے تھے — اور باتیں
کرنے کی وجہ سے ہی وہ ان کی طرف کی آواز نہیں سُن
سکے تھے — پھر جونہی وہ نظر آئے — انسپکٹر جمشید کی سرد
آواز گونجی :

"ہاتھ اوپر اٹھا دو — تم میرے پستول کی زد پر ہو —
روپ سنگھ مارا جا چکا ہے۔"

وُہ بُری طرح اُچھلے — ان کی آنکھوں میں خوف دوڑ
گیا — اور پھر ان کے ہاتھ خود بخود اٹھ گئے — وُہ آگے
بڑھے اور ان کی تلاشی لی — ان کے پاس سے بہت کچھ
برآمد ہوا — اب وہ انھیں وہاں سے روپ سنگھ کے کمرے
میں لے آئے — ان کے کاغذات کا مطالعہ کرنے پر
انھیں حیرت انگیز باتیں معلوم ہوئیں — پھر انھوں نے ان
کی زبان بھی کھلوائی — انھیں رسیوں سے باندھ کر وہیں
ڈال دیا گیا — اور خود وہ پھر سرنگ میں چلنے لگے — وہ سرنگ
کا دوسرا سرا دیکھ کر ان کے بیان کی تصدیق کرنا چاہتے تھے۔
انھیں آدھ گھنٹے تک سرنگ میں چلنا پڑا — تب کہیں

جا کر سرنگ کا دوسرا سرا نظر آیا — یہاں بھی ایک چوکور
سوراخ تھا اور اس میں بٹن بھی تھا — بٹن دبانے سے
پہلے انھوں نے پستول اپنے ہاتھوں میں لے لیے — سرنگ
سے باہر نکل کر انھوں نے عجیب منظر دیکھا —
انھوں نے خود کو شارجستان کی حدود میں پایا — سرحد
کے بالکل نزدیک — کچھ ہی فاصلے پر شارجستان کے فوجی
سرحد پر کھڑے نظر آئے — وُہ فوراً واپس مڑ گئے، فوجی
اگر انھیں دیکھ لیتے تو پھر وُہ گئے تھے کام سے — سرنگ
کا دروازہ بند کر کے وہ واپس آئے — باقی ماندہ رات
انھوں نے روپ سنگھ کے کمرے میں دونوں قیدیوں کے
پاس گزاری — صبح ہونے پر وہ اپنی کار کی تلاش میں
نکلے — کار سڑک پر ہی مل گئی — پانی اتر چکا تھا — انھوں
نے کار میں لگے فون کے ذریعے دارالحکومت سے رابطہ
قائم کیا — آئی جی نثار احمد کو ساری صورتِ حال بتائی —
اور فون رکھ دیا —

چار گھنٹے بعد فوج کی گاڑیاں آتی نظر آئیں — انھیں ساتھ
لے کر اس گاؤں کے گرد بہت خاموشی سے گھیرا ڈالا گیا —
پھر سپیکر پر اعلان کیا گیا :

"ہم لوگ اس گاؤں کے چودھری گنڈا سنگھ سے بات کرنا

چاہتے ہیں۔ اگر وہ آکر ہم سے بات کر لیں گے تو سب
کام بخیر و خوبی ہو جائے گا۔"

"میں آ رہا ہوں۔" غصے میں بھری ایک آواز سنائی دی اور
پھر ایک لمبے چوڑے قد و قامت کا بھاری بھرکم بارُعب آدمی
آتا نظر آیا۔ اس کے دائیں بائیں دو آدمی کلاشن کوفیں اٹھائے
چلے آ رہے تھے۔

"یہ سب کیا ہے۔ آپ لوگوں نے گاؤں کو کیوں گھیرا ہے؟"

"ہم اس گاؤں اور گاؤں کے لوگوں کو چیک کرنا چاہتے
ہیں۔ اگر آپ لوگوں نے چیکنگ میں خلل نہ ڈالا تو کوئی
ناخوش گوار واقعہ نہیں ہوگا اور ہم چیک کر کے چلے جائیں
گے۔ اور اگر آپ لوگوں نے دخل اندازی کی تو پھر خون خرابہ
ہو سکتا ہے۔"

"سوال یہ ہے کہ ہم خلل کیوں ڈالیں گے۔ ہم اس مُلک
کے پُرانے شہری ہیں۔"

"تب ہمیں گاؤں کی تلاشی لینے دی جائے۔"

"آخر آپ کو اس گاؤں کے خلاف اطلاعات کیا ملی ہیں؟"

"اطلاعات۔ یہ کہ اس جگہ ملک کے خلاف کام ہوتا ہے۔"

"ضرور کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو یہ بات اور بھی اچھی ہے۔ آپ ہمیں

اپنا کام کرنے دیں۔ ہم چیکنگ کر کے چلے جائیں گے۔"

"بہت خوب۔ ہم ضرور قانون کی مدد کریں گے، اس لیے
کہ ہم امن پسند شہری ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا رُخ گاؤں کی طرف کیا اور بلند
آواز میں بولا:

"تمام لوگ تلاشی دے دیں۔ یہ صرف تلاشی لیں گے۔ اور
ان کا کوئی مقصد نہیں ہے۔"

"بہت بہتر سرکار۔" بے شمار آوازیں اُبھریں۔

فوجیوں نے ہدایات کے مطابق تلاشی شروع کر دی۔
انھوں نے تلاشی لیے بغیر گاؤں کا ایک گھر بھی نہ چھوڑا۔
ہر شخص کے کاغذات چیک کیے گئے۔ گنڈا سنگھ کی اور اس
کے گھر کی تلاشی لی گئی۔ اس کے کاغذات وغیرہ بھی چیک
کیے گئے:

"ٹھیک ہے۔ ہمارا شک غلط نکلا۔ آپ لوگ تو واقعی
پُرامن لوگ ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ!"

اور وہ واپس چلے گئے۔ اس گاؤں سے بہت دُور
آ کر خان رحمان نے کہا:

"یہ تم نے کیا کیا جمشید؟"

"ایک تو سرحد بہت قریب ہے — یہ لوگ فوراً سرحد
سے مدد مانگ لیں گے — دوسرے گاؤں اسلحے کا بہت
بڑا گڑھ ہے — ہر گھر کے نیچے ایک تہ خانہ ہے — اور ہر
تہ خانے میں بے تحاشہ اسلحہ ہے — ہماری اس فوج کا صفایا
تو ان کے لیے چند منٹ کا کام تھا۔"

"تو پھر اب کیا پروگرام ہے؟"

"ہم شب خون ماریں گے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

پھر اُسی رات — فوجی رینگتے ہوئے گاؤں میں داخل ہوئے،
فوجیوں کے ساتھ وہ لوگ بھی تھے اور سینے کے بل رینگ
رہے تھے — آخر گاؤں میں داخل ہو گئے — ایک ایک
کرکے انھوں نے نہایت خاموشی سے ہر گھر کے افراد کو
قابو میں کیا — صبح ہونے تک تمام لوگوں کو گرفتار کیا جا
چکا تھا — دن نکلنے پر روپ سنگھ کے گھر کے گرد فوج
موجود تھی اور اس کے دروازے پر دستک دے رہی
تھی — وہ آنکھیں ملتا ہوا جب باہر نکلا تو فوجی اس کے
گھر میں داخل ہو گئے —

"یہ — یہ کیا — میں تم پر کیس کروں گا — تمھیں عدالت
میں بلاؤں گا۔"

"آپ ایسا ضرور کیجیے گا۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کے
ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔

"آخر آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟"

"بس دیکھتے جائیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرا دیے۔

پھر سارے گاؤں کے لوگوں کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا،
گنڈا سنگھ کو بھی اسی لائن میں کھڑا کر دیا گیا۔

"ان سب کو گولی مار دی جائے۔"

"کیا — یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں — ہمیں ہمارا جُرم
تک نہیں بتایا گیا، نہ ہمیں کسی عدالت میں پیش کیا گیا —
اور حکم دے رہے ہیں — ہمیں گولی مار دی جائے۔"

"تو تم اپنا جرم جاننا چاہتے ہو — عدالت میں جانا چاہتے
ہو — اپنے اوپر مقدمہ چلوا کر جیل جانا چاہتے ہو۔"

"ہاں! معلوم تو ہو — ہم نے جُرم کیا کیا ہے؟"

"اچھی بات ہے — سُنو اپنا جُرم — تم سب لوگ شارجستان
کے جاسوس ہو — ہمارے ملک میں تخریب کاری کے
لیے بھیجے گئے ہو — بموں کے دھماکے کرتے ہو — مُلک میں
لوٹ مار کا بازار گرم کرتے ہو — یہ ہیں الزامات — مسٹر
گنڈا سنگھ کہہ دو — تم لوگ ایسا کوئی کام نہیں کرتے۔"

"بالکل — کسی نے غلط اطلاع دی ہے — ہم ایسا کوئی

کام نہیں کرتے۔"

"میں تو ایک اور الزام لگانے چلا تھا۔ آپ نے ان کو، ہی ماننے سے انکار کر دیا ہے۔"

"کیا مطلب۔ اور کیا الزام لگائیں گے آپ۔"

"تم لوگ شادرجستان سے یہاں غیر قانونی طور پر آئے ہو۔"

"غلط۔ بالکل غلط۔ کیا تم لوگوں نے گھر گھر کی تلاشی نہیں لی؟"

"ہاں! لی ہے۔ سب کی تلاشی لی ہے۔ کاغذات دیکھے ہیں۔ اور اب میں اعلان کرتا ہوں کہ وہ سب کاغذات بالکل جعلی ہیں۔"

"کیا۔ نہیں۔" وہ چلایا۔

"ایک اور بات بھی بتا دوں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اور وہ کیا؟" اب وہ بہت پریشان ہو چلے تھے۔

"اس گاؤں کے ہر گھر کے نیچے ایک عدد تہ خانہ ہے۔"

"کیا۔ نہیں۔" گنڈا سنگھ چلایا۔

"اور ہر تہ خانہ اسلحے سے پٹا پڑا ہے۔ اس پورے گاؤں سے اتنا اسلحہ برآمد کیا جائے گا۔ جو ایک بڑی جنگ کے لیے دس دن تک کام میں لایا جا سکتا ہے۔"

"نہیں۔ نہیں۔" گنڈا سنگھ نے چلا کر کہا۔

اب تم نہیں کر دیا ہاں۔ بات یہی ہے۔"

م۔ میرا اس میں کوئی قصور نہیں۔ یہ ان لوگوں کا اپنا عل ہے۔"

"لیکن شکل ایک اور ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اور وہ کیا؟"

"خود تمہارے گھر کے نیچے بھی تہ خانہ موجود ہے۔ بلکہ تمہارے باپ دادا کے زمانے کے محل کے نیچے بھی ایک عدد تہ خانہ موجود ہے۔ اس کے ساتھ ایک سرنگ چلی جاتی ہے، وہ سرنگ..."

انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔ اب گنڈا سنگھ کا چہرہ بالکل تاریک نظر آ رہا تھا۔

بھول گئے

"وہ سُرنگ شارجستان کی سرحد کے پاس نکلتی ہے۔ گویا
اس راستے سے ایک تو شارجستان کے لوگ یہاں آتے
ہیں، دُوسرے دھڑا دھڑ اسلحہ لایا جاتا ہے۔ بم لائے
جاتے ہیں، جن کی مدد سے دہشت گردی ہوتی ہے۔
اور اس کام کے انچارج تم ہو گنڈا سنگھ۔ روپ سنگھ
تمھارا خاص آدمی تھا۔ اسے تم نے محل میں ڈیوٹی سونپ
رکھی تھی۔ وہ مہمانوں کو وصول کرتا تھا۔ اور راتوں
رات گاؤں پہنچایا کرتا تھا۔ اسی طرح اسلحہ بھی گاؤں
پہنچتا تھا۔ یہاں جو چند مسلمان گھرانے بتائے جاتے ہیں،
وہ بھی دراصل مسلمان گھرانے نہیں ہیں۔ ہندو اور سکھ ہی
ہیں۔ وہ مصنوعی مسلمان اس لیے بنے ہوئے ہیں، تاکہ
اس بستی پر کوئی شک کی نظر نہ ڈال سکے۔ اب اگر تم
اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہو۔ تو ہم سننے کے لیے تیار

ں۔ اور ہاں، محل کا ذکر تو رہ ہی گیا۔ اس محل
ھوت محل اس لیے بتایا گیا، تاکہ لوگ اس
ے پاس سے بھی گزرنا بند کر دیں۔ اور تم آسانی
ے یہ کام کرتے رہو۔ گاؤں کے لوگوں کے تو
س طرف آنے کا کوئی خوف تھا ہی نہیں۔ یہ انتظام
صرف آس پاس سے گزرنے والوں کے لیے تھا۔
کہ تم لوگوں کو کسی قسم کا کوئی خوف نہ رہ جائے۔
ئی تمھاری حرکات کو نوٹ نہ کرے۔ تم کچھ کہنا چاہو گے
ڈا سنگھ۔"

"ہاں! یہ کہ تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تمھاری یہ
ج تنکوں کی طرح اڑ جائے گی۔ ذرا اپنے اوپر دیکھو۔"
س نے غرّا کر کہا۔

انھوں نے اوپر دیکھا۔ فضا میں ان گنت لڑاکا
طیارے اڑتے نظر آئے۔ ساتھ ہی ان کی گھن گرج
سنائی دینے لگی۔ حیرت کی بات تھی۔ اس قدر جلد
لڑاکا طیارے ان کے سروں پر کیسے آ گئے۔ کیا سرحد
پر ان کے کارنامے کی خبر پھیل چکی ہے۔

"یہ لڑاکا طیارے ہیں، لیکن کیا یہ تم لوگوں کی
موجودگی میں ہم پر گولیاں برسائیں گے۔ نہیں۔ یہ سب

رُعب ڈالنے کے لیے ہے۔"

"جی نہیں — یہ یہاں گولہ باری نہیں کریں گے — یہ
تمھارے مُلک کے خلاف اعلانِ جنگ ہے — ہاں! اگر
تم اس گاؤں کے گرد سے فوجیں ہٹا لو — تو میں ابھی ان
طیاروں کی پرواز بند کروا دیتا ہوں۔"

"تمھارا مطلب ہے — ہم تم لوگوں کو شارجستان جانے
دیں۔" انھوں نے کہا۔

"ہاں! وہ بھی اسلحے سمیت۔" اس نے فخر کے عالم میں کہا۔

"تم شاید جاگتے میں خواب دیکھتے ہو — نہ تو ہم تم
لوگوں کو چھوڑیں گے، نہ اسلحہ ہاتھ سے جانے دیں گے،
اب تم ہمارے ملک کی جیلوں میں رہو گے — یا پھر تم
لوگوں کو موت کی سزا سنائی جائے گی۔"

"ہوں! تم لوگ دونوں ملکوں میں جنگ کرا کے رہو
گے۔" اس نے بھنّا کر کہا۔

"ہمارے فوجی جنگ کے لیے بہت بے چین ہیں — یہ
تو چاہتے ہیں، کسی طرح جنگ چھڑ جائے۔" انسپکٹر جمشید
نے مسکرا کر کہا — اور پھر انھیں فوجی گاڑیوں میں بھرا
جانے لگا — اسلحے کو ٹرکوں میں لادا گیا — اور پھر یہ
قافلہ شہر کی طرف روانہ ہوا، طیارے اسی طرح گرجتے

تے گزرتے رہو — لیکن وہ حملہ نہ کر سکے — اس
ن تک ان کے مُلک کے طیارے بھی حرکت میں آ
ے تھے — جونہی وہ بلند ہوئے — شارجستان کے طیارے
ا واپس جاتے نظر آئے — گویا شارجستان گیدڑ بھبکی دینا
ہتا تھا — جس میں وہ نہیں آئے تھے — جلد ہی آسمان
ان ہو گیا — راستے میں انسپکٹر جمشید نے گنڈا سنگھ
ے کہا:

"مسٹر گنڈا سنگھ — وہ دیکھو — تمھارے طیارے دم دبا
کر واپس جا رہے ہیں۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا — اب دینے کے لیے اس
کے پاس تھا بھی کیا —

"وہ ابا جان! روپ سنگھ کی بے ہوشی سمجھ میں نہیں
ئی — اگر وہ نقلی تھی تو اس کی پتلیاں کیوں ساکن تھیں۔"

"یا تو اس نے مشق کر رکھی تھی — یا پھر اس نے
بے ہوشی کی کوئی دوا کھائی تھی — تاکہ اس کا پول نہ
کھل جاتے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"گویا راستے کا یہ کیس بھی ختم ہوا — ارے ہم تو آگے
جا رہے تھے — اور بارش شروع ہو گئی تھی — حد ہو گئی —

ہمیں تو اپنا سفر وہیں سے شروع کرنا چاہیے۔"

"کریں گے بھئی، ضرور کریں گے۔ لیکن پہلے ان قیدیوں اور اسلحے کو بحفاظت تمام پہنچانا ضروری ہے۔ کہیں دشمن کوئی ہاتھ نہ دکھا جائے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن ہم جا کہاں رہے تھے بھلا؟"

"اوہ! ہم تو بھول ہی گئے۔" فرزانہ چونکی۔

"تو پھر مہربانی فرما کر اب سوچ لیں۔ ہم کہاں جا رہے تھے۔" فاروق نے منہ بنا کر کہا اور وہ سب سوچ میں گم ہو گئے۔

— لکی نمبرز —

۲۰۰۰ روپے کے نقد انعامات

- اس ماہ شائع ہونے والے ناولوں "گھناؤنا کھیل"، "بھوت محل"، "خطرے پہ خطرہ" اور "قاتل کے بل" کے سرورق کی بیک پر انعامی نمبر درج ہے۔
- ہر ناول کے انعامی لکی نمبرز پر ۱۰۰۔۱۰۰ روپے کے پانچ انعامات، اس طرح چار ناولوں پر ۲۰ انعامات روانہ کیے جائیں گے۔
- آپ اپنے ناول سنبھال کر رکھیے۔ ہو سکتا ہے، انعامی لکی نمبر آپ کا ہی نکل آئے۔
- آیندہ ماہ بذریعہ قرعہ اندازی ۲۰ انعامی لکی نمبرز کا اعلان کیا جائے گا۔
- آیندہ ماہ شائع ہونے والے ہر ناول پر بھی لکی نمبر درج ہو گا۔
- آیندہ ماہ کے ناولوں کے حصول کے لیے اپنا آرڈر اپنے قریبی بک شال پر نوٹ کروائیں، اپنے ہاکر کو نوٹ کروا دیں یا پھر براہ راست ادارے کو خط لکھیں۔ شکریہ!